PK 2199 S5M38

Shiblī Nu'mānī, Muḥammad
Maẓāmīn-i Shiblī

PLEASE DO NOT REMOVE
CARDS OR SLIPS FROM THIS POCKET

UNIVERSITY OF TORONTO LIBRARY

مضامین شبلی

از

شبلی نعمانی

[illegible]

١٢

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

Shiblī Nuʻmānī, Muḥammad

مضامین شبلی

Maẓamīn-i Shiblī

از

شبلی نعمانی

PK
2199
S5M38

LIBRARY
DEC 18 1968
UNIVERSITY OF TORONTO

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

مسلمانوں کی علمی بے تعصبی

اور

ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی

چند روز ہوئے اردوئے معلی میں ملا مسیحی کی رامائن پر ایک ہندو مضمون نگار کا ایک مضمون شائع ہوا تھا مضمون کا مقصد بظاہر کتاب پر تقریظ لکھنا تھا، لیکن مضمون نگار نے تقریظ کے پردہ میں جن فیاضانہ خیالات کا اظہار کیا اِس کے اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

"صدیوں سے ایک ایسی کتاب گمنامی کے ظلمات میں پڑی ہوئی تھی، وجہ شاید یہ ہو کہ مسلمانوں نے اسے پسند نہ کیا ہو"

"مسلمانوں نے صدیوں اِس مُلک پر مسلسل حکومت کی اور اس کا خاتمہ بھی ہو گیا مگر اس ملک کے علم ادب کی طرف اُنھوں نے بہت کم توجہ کی ××× ہندو جب انکی رعایا تھے تب بھی وُہ ہندوؤں کے علم ادب سے بیخبر تھے ××× امیر خسرو نے یہاں کی زبان کی طرف توجہ کی تھی مگر محض تفریح کے طور پر وہ ہندی زبان میں کچھ کہہ لیا کرتے تھے، ہندوؤں کی کتابوں کے مطالعہ کی طرف کبھی ان کا خیال نہیں ہوا نہ وہ کچھ ان کی خبر رکھتے تھے،"

"مگر عہد اکبری میں جو کچھ ہوا وہ بہت محدود تھا،"

"داراشکوہ نے البتہ ہندوؤں کی اونچے درجہ کی کتابوں کی طرف بھی توجہ کی تھی" اِس کوشش کی بدولت جو آپ نے ہندوؤں کی کتابوں کا مطلب جاننے کے لیے کی تھی آپ کو کفر کا فتوی ملا اور جان دینا پڑی"

"ملا مسیح کے نام تک کا پتہ نہیں چلتا صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ پانی پت کے رہنے والے تھے"
"اس زمانہ میں کوئی ہندوانہ قصہ لکھنا مسلمانوں کے لیئے آفت سے کم نہ تھا ہندوؤں
کی کوئی بات اپنے قلم سے لکھنے میں مسلمان مصنف کو کافر بننے کا خوف اتنا تنگ کرتا تھا
کہ وہ ایک دم گھبرا جاتا تھا، ملا مسیح نے رامائن تو لکھی ہے، مگر غریب کو بہت کچھ ثبوت دینا
پڑا کہ میں پکا دیندار مسلمان ہوں، کافر نہیں ہو گیا ہوں، شاید ان لوگوں نے رامائن لکھنے پر
آمادہ دیکھ کر کافر کہا ہوگا،

"آپ کے عذر گناہ سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ جہانگیر کے وقت تک بھی
ہندوؤں کی باتوں کی طرف متوجہ ہونے سے مسلمان لوگ کافر سمجھے جاتے تھے یہی وجہ
ہے، کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے لٹریچر سے سدا محرومی حاصل رہی۔ اور اس کا سلسلہ
آج تک ویسا ہی چلا آتا ہے"

یہ مضمون اس شخص کے قلم سے نکلا ہے جو کلکتہ کے مشہور اخبار بھارت مترکا
اڈیٹر ہے اردوئے معلی نے اس کو بغیر کسی قسم کے ریمارک کے شائع کیا ہے، اور ہندوؤں
کے مشہور اردو رسالوں میں بڑی قدردانی کے ساتھ گردش کر رہا ہے،

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی خواہش
ظاہر کرتے ہیں یا جو لوگ ان دونوں فرقوں میں سے کسی فرقہ کے ممتاز اور مسلم لیڈر ہیں،
کیا ان کے قلم سے اسی قسم کے خیالات ظاہر ہونے چاہئیں؟

لیکن اس سے قطع نظر کرکے کیا دراصل یہ واقعات صحیح ہیں؟ کیا مسلمان ہندوؤں
کے ادب و تاریخ جاننے کو کفر سمجھتے تھے؟ کیا دارا شکوہ اسی جرم کا شہید ہے کیا امیر خسرو
کو ہندوؤں کی کتابوں کی مطلق خبر نہ تھی؟ کیا مسیح کی رامائن مسلمانوں کی تعصب کی وجہ سے
گوشۂ گمنامی میں پڑی رہی؟ کیا تاریخ کے صفحوں میں مسیح کا کہیں پتہ نہیں چلتا؟

اخیر سوال، اگرچہ تمام سوالوں کی بہ نسبت کم درجہ کا سوال ہے لیکن ہم کو سب سے

پہلے اسی کا جواب دینا چاہیے کیونکہ اس سے اسباب کے اندازہ کرنیکا موقع ملیگا کہ ہمارے مضمون نگار
دوست کو مسلمانوں کے لٹریچر اور تاریخ سے کس حد تک واقفیت ہے؟ مسیح کی نسبت وہ تحریر فرماتے ہیں،

"ملا مسیح کے نام تک کا پتہ نہیں چلتا،"

لیکن فارسی شعرا کا کوئی تذکرہ ایسا نہیں جسمیں مسیح کا نام، اور اُس کے حالات نہوں
اُمرائے جہانگیری میں مقرب خاں ایک مشہور امیر تھا، جو اصل میں پانی پت کا رہنے
والا تھا، لیکن کرانہ[1] میں سکونت اختیار کرلی تھی، مسیح اسی کا پروردہ تھا، وہ در اصل کرانہ
کا رہنے والا تھا، لیکن چونکہ مقرب خاں کے دامن تربیت میں پلا تھا آقا کی طرح وہ بھی
پانی پت کے انتساب سے مشہور ہوگیا، تذکرہ نہیں اسکی رامائن کا عموماً ذکر ہے مآثر
الامرا میں رامائن کے چند منتخب اشعار بھی نقل کیے ہیں،

مسلمانوں نے ہندوؤں کے علوم و فنون کو جس ذوق شوق سے سیکھا اور انمیں جو مہارت
حاصل کی، اُسکو اپنی کتاب تراجم (مندرجہ رسائل شبلی) میں تفصیل سے لکھا ہے، افسوس ہمارے
ہندو دوست نے اس داستان کا ایک حرف بھی نہیں سنا ہے، ابو معشر فلکی نے دس برس
ہندوستان میں رہکر جس طرح سنسکرت سے علوم و فنون حاصل کیے، ابو ریحان بیرونی نے
سولہ برس کی مدت میں جس طرح سنسکرت میں کمال پیدا کیا، اور ہندوؤں کے علوم و فنون پر مبسوط
کتاب لکھی، (یہ کتاب معہ ترجمہ انگریزی لندن میں چھپ گئی ہے) فیروز شاہ نے جن کتابوں کا
ترجمہ کرایا، اکبر کے دربار نے سنسکرت کتابوں کے ترجمہ کرانے میں جو شاہانہ فیاضیاں دکھائیں
شہزادہ دانیال کو ہندی زبان کے ساتھ جو شغف تھا، آزاد بلگرامی نے ہندی صنائع
و بدائع پر جو مضامین لکھے، قاسم فرشتہ نے اختیارات قاسمی لکھکر ہندوؤں کے علم طب
کو جس طرح فارسی زبان میں منتقل کیا، یہ واقعات اگرچہ ہمارے ہندو دوستوں کے کانوں
تک نہیں پہنچے، لیکن مسلمانوں کی علمی انجمن کا پارینہ افسانہ ہیں اور اسلیے ہم انکو دہرانا نہیں چاہتے

---

[1] تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ اُسکا آبائی وطن کرانہ تھا، صفحہ ۵۵ مآثر الامرا، حالات مقرب خاں ۲۶

لیکن ایک عام غلطی کا رفع کر دینا ضروری ہی، عام خیال یہ ہی کہ پادشاہان ہندوستان میں سب سے پہلے جس نے ہندو پنڈتوں کو دربار میں دخل دیا، اور سنسکرت کی کتابون کے ترجمے کرائے، وہ شہنشاہ اعظم اکبر تھا، لیکن یہ ایک سخت تاریخی غلطی ہی، اکبر سے سیکڑوں برس پہلے سلطان زین العابدین فرمان روائے کشمیر نے، اس علمی صیغہ کی بنیاد ڈالی تھی، ہندوؤن سے جزیہ لینا بھی، اول اُسی نے موقوف کر دیا تھا، اور گاؤکشی بھی اُس نے بند کرا دی تھی،

تاریخ فرشتہ میں سلطان زین العابدین کے حالات میں ہے۔

"در جابہ مقررۂ ہنود او قاف تعین نمود، جزیہ را مانع گشت، و گاؤکشی برطرف ساخت،، و شاہ بر جمیع زبان ہا از فارسی و ہندی و تبتی وغیرہ آن بر وجہ کمال مہارت درست داشت و بہمۂ آنہا حرف می زد، و فرمود، تا اکثرے از کتب عربی و فارسی بزبان ہندی ترجمہ کردند، و بدین دستور کتاب ہندوی بفارسی ترجمہ کردند، و کتاب مہابھارت کہ از کتب مشہورۂ ہند ست، نیز فرمود، تا ترجمہ کردند، و کتاب راج ترنگی، کہ عبارت از تاریخ بادشاہان کشمیر ست در عہد او تصنیف شدہ در زمان اکبر شاہ ترجمۂ مہابھارت را کہ بد عبارت بود، بار دیگر بہ عبارت فصیح آوردند، و تاریخ کشمیر را نیز بہ فارسی ترجمہ کردند،،

ہندوؤں کو کاروبار سلطنت میں دخل دینا بھی، اکبر کی ایجاد نہیں، ابراہیم عادل شاہ جو دکن کا مشہور بادشاہ گذرا ہی، اور اکبر سے، بیس بائیس برس پہلے یعنی ۹۴۲ہجری میں تخت نشین ہوا، اُسنے تمام کاروبار سلطنت ہندوؤں کے ہاتھ میں دیدیا تھا، یہانتک کہ دفتر کی زبان بھی بدل دی تھی، یعنی فارسی کے بجائے ہندی کر دی تھی، تاریخ فرشتہ میں اسکے حالات میں لکھا ہے؛

"دفتر فارسی برطرف ساختہ، بہامنہ (یعنی برہمن) را صاحب دخل گردانید،،

اس موقع پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے، کہ ابراہیم عادل، اکبر کیطرح، ضعیف المذہب نہ تھا، بلکہ سخت مذہبی آدمی تھا، اُسکا خاندان ایک مدت سے شیعی مذہب تھا، لیکن اسنے

مذہب حنفی اختیار کیا، اور تمام ملک میں اسکو رواج دیا،

اِس قسم کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں، لیکن ہم اسوقت اِن جزئیات سے بحث کرنی نہیں چاہتے، اکبر، ابراہیم عادل، فیروز شاہ ابو معشر فلکی، ابوریحان بیرونی، فیضی، غلام علی آزاد نے جو کچھ کیا اگو بہت کیا، لیکن اس سے اصل بحث کا فیصلہ نہیں ہوتا، اکبر وغیرہ فرمانروا تھے، اِس لیئے اُنھوں نے جو کچھ کیا، ممکن ہی کہ ملکی مصلحتوں کے لحاظ سے ایسا کرنے پر مجبور تھے، ابوریحان بیرونی وغیرہ کے کارنامے بھی علمی مذاق کے جوش کی طرف منسوب کر سکتے ہیں اس سے اِس بات کا ثبوت نہیں ہوتا کہ وہ ہندوؤں کے علوم وفنون کے مداح و معترف بھی تھے،

آج یورپ والے ادنی قوموں کی زبانی، اور انکے علوم وفنون سیکھتے ہیں لیکن مدح وتحسین کے لئے نہیں، بلکہ محض واقفیت کیلئے، بلکہ کبھی کبھی صرف ہنسی اڑانے کیلئے اصل سوال یہ ہی کہ کیا مسلمان ہندوؤں کے علوم وفنون کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے؟ کیا انکو ہندوؤنکی سرزمین سے، مذہب سے، زبان سے، کسی قسم کا مذہبی تعصب نہیں تھا؟ ہمارے ہندو مضمون نگار نے اِس سوال کا جواب، صاف لفظوں میں یہ دیا ہی کہ ہندوؤں کے علوم اور زبان کی طرف متوجہ ہونے کو مسلمان کفر خیال کرتے تھے،

ہمارے ہندو دوست کی تاریخ دانی سے اسی جواب کی توقع ہو سکتی تھی، لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ مسلمانوں نے نہ صرف ہندوؤں کے علوم وفنون کو بلکہ ہندوستان کی سرزمین کو بھی اس وقعت کی نگاہ سے دیکھا، کہ کسی اجنبی قوم سے کبھی توقع نہیں کیجا سکتی، اِس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہی کہ ہندوستان کی فضیلت نے مذہبی حیثیت پیدا کی، اور حدیث وتفسیر کی مقدس کتابوں میں اِس قسم کی روایتیں درج کی گئیں۔

مولوی غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی کتاب "غزلان الهند" کے دیباچہ میں اپنی کتاب کی تصنیف کی غرض یہ بیان کی ہی،

"اول این کہ ذکر ہندوستان بہشت نشان از کتب تفسیر وحدیث رقم باید ساخت"۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے تفسیر درمنثور مین، ابن جریر، حاکم، بیہقی، اور ابن عساکر سے حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے"

	اطیب ریحا ارض الهند		سب سے زیادہ خوش ہوا ہندوستان کی سرزمین ہی

اسی کتاب مین متعدد روایتین اس مضمون کی نقل کی ہین، کہ حضرت آدم بہشت سے نکلکر ہندوستان میں آئے، اور اپنے ساتھ وہاں کی خوشبودار ریاحین بھی لیتے آئے، ایک شاعر نے اسی مضمون کو اس پیرایہ میں ادا کیا ہے؛

آدم ز بہشت چون کہ افتاد بہ ہند | ہند است کہ نعم البدل فردوس است

اگرچہ یہ حدیثیں اور روایتین قطعاً موضوع اور جعلی ہین، لیکن اس سے اس قدر ضرور ثابت ہوتاہے کہ ہندوستان کی خوبی اور لطافت سے متعلق مسلمانوں کا خیال تھا؛

ہندوستان کے علوم وفنون کو مسلمانوں نے جس نگاہ سے دیکھا، انکی یہ کیفیت ہی کہ آزاد بلگرامی نے، اپنی کتاب غزلان الہند میں شیخ علی رومی کی کتاب محاضرۃ الاوائل ومسامرۃ الاواخر سے یہ فقرہ نقل کیا ہے،

	اول موضع وضعت فیہ الکتب وانفجرت منہ ینابیع الحکمۃ کان الهند		سب سے پہلے جس سرزمین میں کتابین تصنیف کی گئیں، اور جہان سے حکمت کا چشمہ نکلا، وہ ہندوستان ہے۔

ملا محب اللہ بہاری نے مسلم الثبوت میں لکھا ہے؛

"بعض بزرگون نے مجھ سے بیان کیا کہ ہندوستان کے شمالی، پہاڑون میں میں نے ایک برہمن کو دیکھا، جسکو ایسے کلیات معلوم تھے، جنکے ذریعہ سے وہ ہر زبان کو سمجھ لیتا تھا"

آزاد بلگرامی غزلان الہند میں لکھتے ہیں۔

"جمہور متفق اند کہ حکمائے یونان در علوم ریاضی قصب السبق از دانایان جہان ربودہ اند"

ہندوم حدیث دیں

الاحساب وموسیقی، کہ درین دو فن ہندیان پیش قدم اند، واین دو فن را بجائے رسانیدہ اند کہ فوق آن متصور نیست، وعلمائے ولایات دیگر، اکثر قواعد علم حساب را از ہندیان برگرفتہ اند اما قواعد علم موسیقی را احدی از دانایان ولایت دیگر تا این زمان از نغمہ سرایان ہند اخذ نکردہ واختصاص این فن تا حال بہ اہل ہند مسلم

اسی کتاب میں ایک اور موقع پر لکھتے ہیں،

"ادوم برین کہ، دانایان ہند در اختراع فن بدیع بسر خود اند، نہ از خرمن عرب خوشہ چیدہ اند نہ از ساغر فرس قطرہ چشیدہ چہ زمانہ علم وعلمائے ایشان قدمے دارد کہ در جانب ازل حد آن معلوم است،

علامہ آزاد نے غزلان الہند کے دیباچہ میں تالیف کتاب کے جو اسباب لکھے ہیں، انمیں دو سبب یہ ہیں،

سوم این کہ بعضے صنائع علم ہندی را تعریب باید نمود"

چہارم این کہ فن نایکا بھید را کہ ماہیتش بجائے خود بیان شود، از ہندی بہ عربی باید برد این ارمغان شگرف را کہ مخصوص ہندیان ست، بہ خدمت عرب عربا باید سپرد"

سلطان فیروز شاہ، جو سلطان محمد تغلق شاہ کا برادر عم زاد، اور ۷۵۵ ہجری میں تخت نشین ہوا تھا جب کانگڑہ کی تسخیر کے لیے گیا، اور جوالا مکھی کی سیر کی تو وہاں کے کتب خانہ کو بھی دیکھا،

تاریخ سیر المتاخرین میں جہاں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے،

"ونیز دران مکان کتب بسیاری از براہمہ سلف یافتند، سلطان علمائے آن طایفہ را بجہۃ خواہش طلب داشتہ مضامین آن را شنیدہ محظوظ گردید و فرمود بعضے از ان کتب[1] را بہ فارسی ترجمہ کنند، تا مطلب آن بدست و بہ آسانی فہمیدہ آید، مولانا اعز الدین حسب الامر

---

[1] تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے، کہ ۱۳۰۰ کتابیں تھیں جنمیں سے بعض کتابوں کا ترجمہ بھی ہوا۔

کتابے در حکمت طبیعی از آن کتب چیدہ مطالب آن را در سلک نظم کشید، و بکتاب فیروز شاہی موسوم گردانید، سُلطان بغایت پسندیدہ بصلہ آن نقود و بسیاری از طلا و نقرہ بضافۂ جاگیر مرحمت کرد، و مضمون آن کتاب اکثر اوقات، مذکور محفل سُلطانی می شد،،

ہمارے ہندو دوست فرماتے ہین کہ ہندوٗن کے علوم و فنون کی طرف توجہ کرنے سے مسلمان معرضِ خطر مین پڑ جاتا تھا، اور کافر خیال کیا جاتا تھا، لیکن عبارت مذکورۂ بالا سے معلوم ہوا کہ خطرہ کے بجائے ہندی تصنیفات کے ترجمہ کرنے سے انعام، اور منصب و جاگیرین ملتی تھیں ع ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا + یہ بھی ملحوظ رہے کہ فیروز شاہ اکبر کی طرح دنیاساز، اور ظاہردار نہین تھا، بلکہ ٹھیٹ مسلمان اور سخت پابند مذہب اور ان باتوں کے ساتھ نہایت عادل، اور انصاف پرست تھا،

حضرت امیر خسرو دہلوی نے ایک مثنوی نو سپہرون میں نُہ سپہر نام لکھی ہی، اُسمیں ایک مستقل باب ہندوستان کے فضائل کا قائم کیا ہی، اور فضیلت کے مختلف وجوہ قرار دئے ہین، اِن وجوہ مین سے ایک وجہ فضیلت علمی قرار دی ہے، اور اس پر بس دلیلین قائم کی ہین، جن میں سے بعض حسب ذیل ہین۔

۱، یہان تمام دنیا کی بہ نسبت علم نے زیادہ وسعت حاصل کی،

۲، ہندوستان کے آدمی دُنیا کی تمام زبان حاصل کر سکتے ہین، لیکن اور کسی مُلک کا آدمی ہندی زبان نہیں بُول سکتا،

۳، ہندوستان میں دُنیا کے ہر حصہ کے لوگ علم کی تحصیل کے لیئے آئے، لیکن کوئی ہندی تحصیل علم کے لیئے، ہندوستان سے باہر نہین گیا۔

۴، علم حساب مین صفر، ہندوستان کی ایجاد ہے،

۵، کلیلہ دمنہ جو تمام دنیا کی زبانون میں ترجمہ ہوئی، ہندوستان کی تصنیف ہی،

۶، شطرنج ہندوستان کی ایجاد ہے،

۷، موسیقی کو جو ترقی ہندوستان میں ہوئی کہیں نہیں ہوئی،

ناظرین کی دلچسپی اور مزید اطمینان کے لیئے ہم کتاب مذکور کے اصل اشعار حاشیہ میں نقل کر دیتے ہین،

تانہ بود در سخن بندہ شکے ... حجت این گفت، ده، آرم نہ یکے
اولش آن شد کہ درین ملک برن ... علم ہمہ جا است زاندازہ فزون
ہست دوم آن کہ زہند آدمیان ... جملہ بگویند زبان ہا بہ بیان
لیک از اقصائے دگر ہر کسے ... گفت نیارد سخن ہند بسے
ہست خطا و مغل و ترک و عرب ... در سخن ہندوی ما دوختہ لب
حجت سوم نگر از من بہ خرد ... کان زرہ عقل، قبول است نہ رد
کین طرف از ہر طرفے اہل ہنر ... در طلب علم و ہنر کرد گذر
لیک بہ تحصیل حکم بہر شرف ... برہمن از ہند نہ شد ہیچ طرف
نیست نہان آن کہ سوے ہند بگر ... کرد ابو معشر دانندہ گذر
آمد و دہ سال در آموخت سخن ... در حد بانارسی آن شہر کہن
پس فن تنجیم بہ آموخت چنان ... کز حکما بُد و درین شیوہ عنان
ہست یقین آن کہ درین علم کسے ... نیست چو او تجربہ کردم بسے
اورقم خود کہ نوشت ہمہ ... آن ز سیاہی ہنود ہست ہمہ
حجت چارم رقم ہندسہ بین ... کاہل جہان وضع ندید چنین
ہم بہ یکے صفر کہ نقشے است تہی ... بین چہ رموز است چو خطیش دہی
واضع این نسخہ اسا نام یکے ... بود برہمن کہ درین نیست شکے
ہنداسا شد چو از نام عدد ... ہندسہ، تخفیف شد از اہل خرد
وضع دی از برہمن نادہ بہ بین ... حکمت یونان شدہ محتاج برین

حضرت امیر خسرو نے صرف ہندؤن کی علمی فضیلت ہی ثابت کرنے پر اکتفا نہین کیا، بلکہ اُنکے مذہب کا بھی اسلام کے علاوہ، اور تمام مذاہب سے مقابلہ کیا ہی اور ترجیح دی ہے، چنانچہ فرماتے ہین،

برہمن از ہستی او راندہ نفس	از ثنوی کش بہ دوی رفتہ و بس
عیسویان، زوج و ولد بستہ برو	ہندو ازین جنس نہ پیوستہ برو
قوم مجسم ز تجسم زدہ	برہمنان نے دم ازین قسم زدہ
اختریان ہفت خدا بردہ گمان	گفتہ یکے ہندو و ثابت ہمان
حجت* پنجم بہ بیان شرح کنم	مدعیان را بہ خرد جرح کنم
دمنہ کلیلہ ز ود دام سخن	آنکہ ہم از ہندنشانے است کہن
گشت چو بو دست بہ معنی ہنرے	پارسی و ترکی و تازی درے
حکمت ازین بہ چہ بود، کز ہمہ سو	سوے وے آرند حکیمان ہمہ رو
حجت ششم، بازی شطرنج شنو	انچہ کراز سینہ بر دو رنج مشنو
ہست ہم از ہند یکے وضع گران	این فن طرفہ کہ درو نیست کران
ز وحد و اندازہ بجستند بسے	غایت و پایانش ندانست کسے
چون ہمہ گشتند بہ اجماع زبون	کین چنین از صورت امکان ست برون
برتری از ہند بجستند، ہمہ	معترف عجز نشستند، ہمہ
حجت ہشتم آن کہ سرود خوشش ما	کو ست بسوزد دل و جان آتش ما
برہمہ دانستہ کہ در جملہ جہان	نیست بدین گونہ و این نیست نہان

* [illegible] صفحہ ۱۹۷

اسی باب مین اس سے پہلے ہندؤن کے علوم و فنون کی عام طور پر تعریف کی ہی، چنانچہ کہتے ہین۔

منطق و تنجیم و کلام است درو	ہر چہ کہ جز فقہ، تمام ست درو

قوم مشبہ سوی تشبیہ شدہ	ہندو ازین ہاش بہ تنزیہ شدہ
خلق دگر نور و ظلم خواندہ بدل	ہندو ازین ہا ہمہ پیوند گسل

ان اشعار مین ہندو مذہب کی ترجیح کے وجوہ یہ بیان کیے ہین، کہ ثنوی فرقہ خدا کو دو مانتا ہے بخلاف اسکے ہندو ایک مانتے ہین، عیسائی حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں، لیکن ہندو اس قسم کے عقائد کے قائل نہیں، فرقہ مجسمہ خدا کو صاحب جسم مانتا ہے، لیکن ہندو ایسا اعتقاد نہیں رکھتے، ستارہ پرست سات خدا مانتے ہین، لیکن ہندو اس قسم کے عقاید کے قایل نہیں فرقہ مشبہ خدا کو ممکنات سے تشبیہ دیتے ہیں، ہندو اسکے خلاف ہیں، پارسی، نور و ظلمت، دو خدا مانتے ہیں، لیکن ہندو اس خیال سے بری ہیں،

اسی کتاب میں حضرت امیر خسرو نے سنسکرت سیکھنے کا بھی ذکر کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:-

من قدرے بر سر این کار شدم	در دل شان محرم اسرار شدم
ہر چہ بہ اندازۂ خود رمز خسرد	جستم ازان قوم و نہ بود اندر خرد[1]

ہمارے ہندو دوست تحریر فرماتے ہین کہ

جہانگیر کے وقت تک بھی ہندوؤں کی باتوں کی طرف متوجہ ہونے سے مسلمان لوگ

(نہ سپہر صفحہ ۱۰۱)

بر ہمنے ہست کہ در علم خرد	دفتر قانون ارسطو بدرد
علم دگر ہر چہ معقول سخن	بیش ترے ہست ز آئین کہن
وانچہ طبیعی و ریاضی ست ہمہ	ہیأت مستقبل و ماضی ست ہمہ
رومی ازان گونہ کہ افگند بر ون	ہندوگان راست ازان پایہ فزون

[1] امیر خسرو کے ان اشعار پڑھنے کے بعد مضمون نگار صاحب کی اس رائے پر نظر ڈالو کہ "امیر خسرو نے یہان کی زبان پر توجہ کی تھی، مگر محض تفریح کے طور پر، ہندوؤں کی کتابوں کے مطالعہ کیطرف کبھی انکا خیال نہیں ہوا، نہ وہ انکی خبر رکھتے تھے" یہ ہے ہمارے نامہربان بھائیوں کی تحقیقات

کافر سمجھے جاتے تھے،،

لیکن خود جہانگیر کا یہ حال تھا کہ اُس زمانے مین، جو بڑے بڑے پنڈت اور سناسی موجود تھے اور جنگلوں یا کھوؤن مین زندگی بسر کرتے تھے، دشوار گذار راستہ طے کرکے اُن کے پاس جاتا تھا، اور نہایت خوش اعتقادی کے ساتھ اُن سے ہندو مذہب کے حقائق، ومعارف سیکھتا تھا،

جہانگیر کے زمانہ میں سب سے زیادہ مشہور سنیاسی اور ویدانت کا عالم جدروپ تھا، جہانگیر جس شوق سے اِس سے ملنے گیا ہے، اور جس خلوص واعتقاد سے اسکی باتین سُنی ہیں، اسکا حال خود تزک جہانگیری میں لکھتا ہے،

"مکرر شنیدہ بودم کہ سنیاسی مرتاضی، جدروپ نام، کہ چندین سال است کہ نزدیک معمورہ اجین درگوشۂ صحرا از آبادانی دور متوجہ ومشغول پرستش معبود حقیقی است، خواہش صحبت او بسیار داشتم، وقتیکہ در دار الخلافت آگرہ بودم میخواستم کہ او را طلبیدہ ببینم، غایۃ ملاحظۂ تصدیع او کردہ نہ طلبیدم چون بحوالی شہر مذکور رسیدم، از کشتی برآمدہ نیم پاؤ کردہ پیادہ بہ دیدن او متوجہ گشتم،،

"علم بیدانت را کہ علم تصوف باشد، خوب ورزیدہ، تا شش گھڑی با او صحبت داشتم، سخنان خوب مذکور ساخت، چنانچہ خیلے در من اثر کرد،[1]

اِسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر لکھتا ہے،

"باز خاطر را بہ ملاقات گسائین جدروپ رغبت افزود، بے تکلفانہ بکلبۂ او شتافتہ صحبت داشتہ شد، سخنان بلند دلنشین آمد، حق جل وعلی عجیب توفیقے کرامت فرمودہ، فہم عالی وفطرت بلند ومدرکہ تند را با دانش خدا داد جمع، و دل از تعلقات آزاد ساختہ، پشت پا بر عالم وما فیہا زدہ، در گوشۂ تجرید مستغنی وبے نیاز نشستہ، روز یکشنبہ چہار دہم باز بہ

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۱۷۵ و ۱۷۶

ملاقات گشایش رفته، از وداع شدم، بے تکلف، جدائی از صحبت او بر خاطر حقیقت گزین گرانی نمود۔"

ان الفاظ کو پڑھو، اور انصاف کرو، کہ کیا کسی شخص کے ساتھ اس سے زیادہ خوش اعتقادی، اخلاص اور گرویدگی کا اظہار کیا جاسکتا ہے، ایک ایسے باعظمت شہنشاہ کا ایک ہندو فقیر بے نوا کے پاس پاؤکوس پاپیادہ چلکر جانا چھ چھ گھڑی تک اسکی خدمت میں حاضر رہنا، اسکی باتوں سے کمال درجہ متاثر ہونا، اسکے فضائل وکمالات، اور قطع تعلقات دنیاوی پر حیرت ظاہر کرنا، چلتے وقت اسکی جدائی کا سخت افسوس ہونا، کیا اسی کا نام تعصب ہے؟ کیا ایک ہندو بھی کسی اپنے ہم مذہب پیشوا کے ساتھ اس سے زیادہ خلوص اور عقیدت ظاہر کرسکتا ہے؟

جہانگیر کی یہ حالت جدروپ کے ساتھ مخصوص نہ تھی، وہ عموماً ہندو علما و فضلا کی صحبت پسند کرتا تھا، تزک میں اس قسم کے بہت سے واقعات درج کیے ہیں، ایک موقع پر لکھتا ہے:

"درہمین منزل، شب شبرات واقع شد، جوگی بسیار جمع آمدہ بودند، ولوازم این شب بفعل آمدہ وبادانایان این طائفہ صحبتہا داشتہ شد۔"

جہانگیر کے زمانے میں ایک اور سنیاسی صاحب کمال تھا، جہانگیر اسکی خدمت میں بھی حاضر ہوا، چنانچہ خود تزک جہانگیری میں لکھتا ہے:

"درکنار تال کاکریہ، سنیاسی کہ از مرتاضان طائفہ ہنود اند، کلبۂ درویشانہ ساختہ، منزوی بود، چون خاطر ہموارہ بہ صحبت درویشان راغب است بہ بے تکلفانہ بہ ملاقات او شتافتم، و زمانے ممتد صحبت او را دریافتم، خالی از آگہی ومعقولیتے نیست، واز آئین دین خود، از مقبات صوفیہ وقوف تمام دارد۔"

ـــــــــــــــــــ

لہ تزک جہانگیری صفحہ ۲۷۹ و ۲۸۰ کہ صفحہ ۲۳۷ مطبوعہ علیگڑھ۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہی کہ یہ وہی جہانگیر ہے، جسکی نسبت ہمارے ہندو دوست نے اسی مضمون میں لکھا ہی،

"جہانگیر کی توجہ اس طرف (یعنی ہندؤں کی باتوں کی طرف) نہ تھی، اپنی رام رنگی سے (شراب کا نام ہی) حضرت کو فرصت ہی کہاں تھی، جو اور طرف متوجہ ہوتے"

اس امر کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے، کہ جہانگیر اپنے باپ کیطرح، ضعیف المذہب اور سُست عقیدہ نہ تھا، بلکہ مذہبی باتوں میں نہایت تعصب رکھتا تھا، وہ اکبر کیطرح ہندؤں کے عقائد کا معترف نہ تھا، بلکہ اُن سے مذہبی مباحثہ کیا کرتا تھا، ایک مناظرہ کا ذکر خود اپنی تزک میں کیا ہی، اور فخر کے لہجے میں لکھا ہی کہ ہندو آخر ساکت ہو گئے۔ صوبۂ بہار کا راجہ جسکا نام روزافزوں تھا، اُسکی فیض صحبت سے اسلام لایا، چنانچہ تزک میں لکھتا ہی،

"روزافزوں کہ از راجہزادہاے معتبر صوبۂ بہار بود، واز خوردی باز بخدمت حضور قیام می نمود، او را بشرف اسلام، مشرف ساختہ، الخ،"

بااین ہمہ اُسکی بے تعصبی کا یہ حال تھا، کہ جب کسی شخص کو مرید کرتا تھا (سلاطین تیموریہ لوگونکو مرید بھی کیا کرتے تھے، اور ان سے بیعت بھی لیتے تھے) تو اُس سے یہ اقرار لیتا تھا، کہ کسی مذہب و ملت سے عداوت نہ رکھے گا، چنانچہ خود لکھتا ہی،

"در وقت ارادت آوردن مریدان، چند کلمہ بطریق نصیحت مذکور می گردد، باید کہ وقت خود را بہ دشمنی ملتے، از ملتہا، تیرہ و مکدر نسازند، با جمیع اسباب ملل، طریق صلح کل مرعی دارند،"[۱]

ملا مسیح اور اُنکی رامائن کے متعلق، جو خیالات ہمارے ہندو دوست نے ظاہر کیئے ہین، اُسکی یہ کیفیت ہی، کہ بے شبہہ رامائن کو قبول عام نہیں حاصل ہوا، لیکن اسکی وجہ تعصب نہیں ہی، مسیح ایک معمولی درجہ کا شاعر تھا، اسکے کلام میں فارسیت کا مزہ بالکل نہین، اساتذۂ فن میں وہ کبھی شمار نہیں کیا گیا، وہ رامائن کے بجائے اگر صحابہ کے حالات

---

[۱] تزک جہانگیری صفحہ ۲

بھی لکھتا تب بھی کوئی نہ پوچھتا، رامائن کو اس قدر مقبولیت بھی ہوئی، تو صرف اس وجہ سے کہ ایک نیا مضمون تھا، فردوسی نے شاہنامہ مین اگبرون کے قصے لکھے، صولت ترکستانی نے صولت فاروقی میں حضرت ابوبکر و حضرت عمر کے فتوحات نظم کیئے، اور فردوسی کو گالیاں دیں کہ اس نے کافروں کے نام کو کیوں زندہ کیا، چنانچہ فرماتے ہیں۔

ازین پیش شاید سخن گوی طوس	بہ دروغ سخن آبش از جوی طوس
مُغ مغ نسب گبر آتش پرست	بہ بیت ابہر موبدے داوہ دست
دلش گبر و جان گبر و گبری زبان	زگبران بگبری زبان قصہ خوان

لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ فردوسی کا شاہنامہ بچے بچے کی زبان پر ہے اور صولت فاروقی کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، اگر مسلمانوں میں تعصب ہوتا، تو نتیجہ اسکے برعکس ہونا چاہیئے تھا، مُلا مسیح صاحب اگر خود بانی اسلام کے حالات لکھتے، تب بھی مقبول نہ ہوتے، ملا مسیح کے جو اشعار ہمارے ہندو دوست نے نقل کیئے ہیں، بے شبہہ وہ تعصب سے لبریز ہیں، لیکن مسلمانوں کے تعصب کا اندازہ حضرت امیر خسرو ابومعشر فلکی ابوریحان بیرونی، عبدالجلیل بلگرامی فیضی، ملک محمد جائسی، آزاد بلگرامی، سلطان فیروز شاہ، ابراہیم عادل شاہ، اکبر، جہانگیر، دانیال، عبدالرحیم خانخانان سے کرنا چاہیئے؟ یا بیچارے مسیح پانی پتی، اور صولت ترکستانی سے، جن کو کوئی جانتا بھی نہین،

برج بھاشا زبان
اور
مُسلمان

ناظرین کو یاد ہوگا، کہ ایک سربرآوردہ ہندو اڈیٹر نے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں دعویٰ کیا تھا، کہ مسلمانوں نے تعصب مذہبی کی وجہ سے ہندی علم ادب کو کافر کہکے پکارا، اس کا جواب الندوہ کے پرچہ میں "مسلمانوں کی بے تعصبی" کے عنوان سے لکھا گیا تھا، جسمیں مسلمانوں کی اِن فیاضیوں کو بہ تفصیل دکھایا گیا تھا جو سنسکرت اور بھاشا کی تصنیفات کی حفاظت، ترجمہ اور اشاعت کے متعلق اُنسے ظہور میں آئیں، یہ مضمون اُسی کا دوسرا حصہ ہے، اسمیں یہ دکھایا ہے کہ ترجمہ اور اشاعت کے علاوہ مسلمانوں نے خود بھاشا زبان میں کیا کیا تصنیفات کیں، اور بھاشا کی شاعری میں کس درجے کا کمال پیدا کیا،

یہ امر بھی اس موقع پر لحاظ کے قابل ہے کہ سنسکرت زبان ایک مدت سے متروک ہے یعنی ایک زمانہ دراز سے خود ہندو بھی اس زبان میں تصنیف و تالیف نہیں کرتے، اور عہد اسلام کے زمانہ سے تو غالباً کوئی کتاب اس زبان میں نہیں لکھی گئی، ہندوؤں کی تصنیفات یا شاعری جو کچھ ہے بھاشا زبان میں ہے، اسلئے مسلمانوں نے بھی جو کچھ لکھا، اسی بھاشا زبان میں لکھا"

عام طور پر مشہور ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے بھاکھا زبان میں شعر و شاعری کی وہ حضرت امیر خسرو ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلہ کا پتہ آگے تک چلتا ہے، مسعود سعد سلمان جو سلطنت غزنویہ کا مشہور شاعر گذرا ہے، اور جو حضرت امیر خسرو سے تقریباً دو سو برس پہلے تھا، اسکی نسبت تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں، کہ ہندی زبان میں بھی

اسنے ایک دیوان لکھا تھا، تذکرہ مجمع الفصحا میں لکھا ہے۔

"الحاصل وے راسہ دیوان بود، تازی، ہندی، پارسی"

اِس واقعہ سے صرف والہ داغستانی نے اس بنا پر انکار کیا ہو کہ کوئی شخص کسی دوسرے ملک کی زبان میں اسقدر کمال نہیں پیدا کر سکتا کہ اسمیں شاعری کر سکے لیکن مولوی غلام علی آزاد نے اس شبہہ کو اسطرح رفع کر دیا، کہ مسعود سعد سلمان گو خاندان کے لحاظ سے ایرانی تھا لیکن پیدا لاہور میں ہوا تھا، اسلیئے ایک ہندوستان زاکا ہندی میں اس درجہ کا کمال پیدا کرنا کچھ بعید نہیں،

حضرت امیر خسرو نے سنسکرت اور بھاکھا میں جو کمال پیدا کیا، وہ محتاج اظہار نہیں مثنوی نہ سپہر میں اُنھوں نے خود اپنی سنسکرت دانی کا ذکر کیا ہو، افسوس ہو کہ انکے بھاکھا کے خالص اشعار آج ناپید ہیں، عام زبانوں پر صرف وہ اشعار ہیں جنمیں اُنھوں نے فارسی اور بھاکا کو پیوند دیا ہی، مثلاً

چو شمع سوزان چو ذرہ حیران نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں	ز مہر آن مہ بگشتم آخر نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

اِس طرز کے انکے اشعار عام طور پر مشہور ہیں، اسلیئے ہم انکو قلم انداز کرتے ہیں

امیر خسرو کے بعد شیر شاہی عہد میں ملک محمد جائسی پیدا ہوئے، وہ بھاکھا زبان کے ایسے بڑے زبردست شاعر تھے، کہ خود ہندوؤں میں آج تک کوئی اُن کا ہمسر نہ پیدا ہوا، پدماوت، انکی مثنوی آج موجود ہے اور گھر گھر پھیلی ہوئی ہو، ہندوؤں میں سب سے بڑا شاعر آخر زمانہ کا کالی داس گذرا ہے، جسنے رامائن کا بھاکھا میں ترجمہ کیا ہو، نکتہ شناس بیان کرتے ہیں کہ قدرت زبان کے لحاظ پدماوت کسی طرح رامائن سے کم نہیں، اور اسقدر تو ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ پدماوت کے صفحہ کے صفحہ پڑھتے چلے جاؤ، عربی فارسی کے الفاظ مطلق نہیں آتے، اور یوں شاذ و نادر تو رامائن بھی ایسے الفاظ سے

خالی نہیں، ملاحظہ ہو،

رام اینگت گریب نوا جے (غریب نواز)	نوک بہ بر و برا سجے
گنی، اگریب، گرام، زناگر (غنی، غریب)	پنڈت موڑھے ملین اُجاگر

ملک محمد جائسی نے پدماوت کے سوا بھاکھا میں اور بھی دو مثنویاں لکھیں، جو انکے خاندان میں اب بھی موجود ہیں، لیکن افسوس کہ اُنکے چھپنے کی نوبت نہیں آئی،

اکبر کے زمانہ میں ہندی زبان کو اور بھی قبول عام حاصل ہوا، نوبت یہانتک پہونچی کہ اُمرا اور شہزادے تک ہندی زبان میں شاعری کرتے تھے، شہزادہ دانیال دپسر اکبر شاہ) کے ضمنی تذکرہ میں جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے،

"بہ نغمہ ہندی مائل بودگاہے بزبان اہل ہند و بہ اصطلاح ایشان شعرے میگفت، بد نبود"

عبدالرحیم خانخانان جو دربار اکبری کا گل سرسبد تھا، ہندی شاعری میں کمال درجہ رکھتا تھا، اسی کتاب میں خانخانان کی وفات کے ذکر میں لکھا ہے،

"خانخانان در قابلیت و استعداد یکتائے روزگار بود، زبان عربی و ترکی و فارسی و ہندی می دانست، و از اقسام دانش عقلی و نقلی حتی علوم ہندی بہرہ وافی داشت، و بزبان فارسی و ہندی شعر میگو گفتی"

جہانگیر کے زمانہ میں غواصی نام ایک شاعر تھا، اسنے طوطی نامہ کو جو نثر میں تھا، اس طرح نظم کیا کہ ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی میں تھا، اس سے انکی قدرت زبان کا اندازہ ہو سکتا ہے، میر حسن[1] صاحب اپنے تذکرۂ شعرا میں لکھتے ہیں،

"غواصی تخلص در وقت جہانگیر بادشاہ بود، طوطی نامہ نخشبی را نظم نمودہ است بزبان قدیم نصفے فارسی و نصفے ہندی بطور ریختہ کہانی، سرسری دیدہ بودم شعر آن نظم بریادنیست،"

اسی زمانے میں ملا نوری، ایک بزرگ تھے، جو قصبہ اعظم پور کے قاضی زادوں میں تھے، اور فیضی سے نہایت اتحاد رکھتے تھے، وہ اگرچہ فارسی کہتے تھے، لیکن کبھی

[1] میر حسن مصنف بدر منیر کا تذکرۂ شعرا ہمارے کتب خانہ میں موجود ہے۔

کبھی ہندی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے، ریختہ یعنی اردو زبان کی ترکیبیں بھی، اُنکے کلام میں پائی جاتی ہیں، چنانچہ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں ان کا ایک شعر نقل کیا ہے،

ہر کس کہ خیانت کند البستہ بترسد — بیچارہ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

اکبری اور جہانگیری دور میں سب سے زیادہ جسنے اس فن میں نام پیدا کیا، وہ شیخ شاہ محمد بن شیخ معروف فرملی تھے، یہ بلگرام کے رہنے والے تھے، اور حصار کی حکومت پر ممتاز تھے، ایک دفعہ سفر میں ایک ہندو لڑکی کی حاضر جوابی اُن کو بہت پسند آئی، اسکو ساتھ لائے اور تربیت کی، چنانچہ اُنکے اکثر دوہے اور کبت اسی کے ساتھ سوال و جواب میں ہیں،

ایک دفعہ سفر سے آئے اُسنے اُن کو مدت کے بعد دیکھا، تو جوش محبت سے اُسکی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اُنھوں نے کہا،

کم ڈرگ بھری سنار کیوں تیری آنکھ آبدیدہ ہوئی اے نازنین		تم آیو بہا یو نہن ؟ کیا میرا آنا پسند نہیں ہوا،	

اس نے برجستہ کہا،

لینھن نین پکھار آنکھ صاف کرنا		لمن ہتی تو کو درس بن گرد آلود تیرے دیدار کے بغیر	

یعنی، چونکہ میری آنکھیں تمہاری جدائی میں گرد آلود ہو رہی تھیں اسلیئے میں نے اُنکو آنسوؤں سے دھو لیا،

شیخ محمد کے اشعار نہایت کثرت سے سرو آزاد کے دوسرے حصہ میں نقل کیے ہیں،

لـه یہ بات جتا دینے کے قابل ہے، کہ مولوی غلام علی آزاد نے سرو آزاد جو تذکرہ لکھا اسکے دو حصے ہیں، ایک فارسی شعرا کے ذکر میں، اور دوسرا ہندی یعنی بھاشا کہنے والوں کے حالات میں اس دوسرے حصہ کی تمہید میں لکھتے ہیں،

تیموری سلاطین بھاشا زبان کی شاعری کی اسیطرح قدردانی کرتے تھے جسطرح وہ اپنی شاہی زبان (فارسی) کے قدردان تھے، اور یہ اس بات کا بڑا سبب تھا کہ ہندی بھی روز بروز ترقی کرتی جاتی تھی، راجہ سورج سنگھ نے جب ایک ہندو شاعر کو جہانگیر کے دربار میں پیش کیا، اور اسنے ایک اچھوتے مضمون کی نظم پڑہی، تو جہانگیر نے ایک ہاتھی انعام میں دیا، چنانچہ خود تزک میں لکھتا ہے،[1]

"واین تازگی مضمون از شعرائے ہند کم بگوش رسیدہ بہ جلدوی این مدح فیلے بہ او مرحمت کردم"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹) "فصل ثانی در ذکر قافیہ سنجان ہندی جزاہم اللہ بجایزۃ الخیر من ہیچمدان بازبان عربی، وفارسی وہندی آشنایم واز ہر سہ یکیدہ بقدر حوصلہ قدحے می پیمایم مشق سخن ہندی ہرچند اتفاق نیفتاد، اما سامعہ را از نوائے طوطیان ہند حظی وافر است و ذائقہ را از چاشنی شکر فروشان این گل زمین نصیبی متکاثر، افسون خوانان ہند ہم درین وادی پائے کمی ندارند، بلکہ در فن نایکا بید قدم سحرسازی پیش می گذارند، موزونان زبان ہندی در بلگرام فراوان جلوہ نمودہ اند لہذا فصل این جماعہ علیحدہ بہ تحریر رسید، و شمامہ معطری بدست بوشناسان حوالہ گردید،"

پھراس حصہ کے خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

"بہ اقتضائے ترتیبی کہ درین تالیف اختیار افتادہ ختم کتاب بر نظم ہندی درست بہم دادہ چہ مضائقہ بعض الفاظ ہندی جزو فرقان عظیم است،"

سرو آزاد کا یہ حصہ ہمارے دوست نواب نور الحسن خاں خلف اکبر جناب نواب صدیق الحسن خاں مرحوم نے اپنے تذکرہ طور کلیم میں تمامہ شامل کر لیا ہے، چنانچہ فروغ دوم میں جہاں سے ہندی شعرا کا تذکرہ ہے عبارت تمہید بھی وہی سرو آزاد کی ہے، میں اس مضمون میں بلگرامی شعرائے بھاکا کا جو تذکرہ لکھوں گا، اور انکے اشعار نقل کرونگا وہ طور کلیم سے منقول ہونگے، لیکن طور کلیم کا یہ حصہ دراصل سرو آزاد ہی ہے، طور کلیم چھپ گیا ہے، اور ہر جگہ ملتا ہے، اس لئے وہ ناظرین کو بہ آسانی ہاتھ آسکتا ہے، ورنہ خود سرو آزاد میرے پاس موجود ہے۔

[1] تزک جہانگیری مطبوعہ علیگڈھ

جہانگیر کے حکم سے ان اشعار کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا گیا،

گر پسر داشتی جہاں افروز	شب نہ گشتے ہمیشہ بودے روز
زاں کہ چوں او نہفت افسر زر	بہ نمودے کلاہ گوشہ پسر
شکر کز بعد او چناں پدرے	جانشین گشت این چنین پسرے
کہ ز شنقار گشتن آں شاہ	کس بہ ماتم نہ کرد جامہ سیاہ

ان اشعار کا حاصل یہ ہی کہ اگر آفتاب کے کوئی بیٹا ہوتا تو کبھی رات نہ ہوتی، کیونکہ جب آفتاب چھپ جاتا تو اسکا بیٹا اسکے بجائے عالم افروزی کرتا خدا کا شکر ہی کہ آپ کے والد (اکبر شاہ) کو خدا نے ایسا بیٹا دیا، کہ لوگوں نے اُنکے انتقال کا غم نہ کیا۔

ہندی تصنیفات کے ساتھ مسلمانوں کی توجہ کی یہ نوبت پہونچی کہ لوگ ہندی کی مشہور کتابوںکو زبانی یاد کرتے تھے، امین رازی تذکرہ ہفت اقلیم میں میر ہاشم محترم کے حال میں لکھتے ہین،

"امروز در ہند است، تمام کتاب مہابھارت را کہ متجمع اسامی غریبہ و حکایات عجیبست در ذکر دارد"

اس مسئلہ میں حیرت انگیز بات یہ ہی، کہ عالمگیر کو نہایت متعصب کہا جاتا ہے اور عام خیال یہ ہی کہ وہ ہندوؤنکے علوم اور زبان سے نہایت نفرت رکھتا تھا، لیکن مسلمانوں نے بھاشا زبان پر جسقدر اسکے زمانہ میں توجہ کی پہلے بھی نہیں کی تھی ضمیر ایران کا ایک مشہور شاعر تھا، وہ عالمگیر کے زمانہ میں ایران سے آیا، اور شاہی منصبداروں میں مقرر ہوا، اسنے، بھاشا زبان میں انتہا درجہ کا کمال پیدا کیا، اگرچہ بھاشا و سنسکرت کے الفاظ کا وہ صحیح تلفظ نہیں کر سکتا تھا، تاہم اسمیں نہایت برجستہ اشعار کہتا تھا، ہندی میں اسکا تخلص تھپی تھا، پارجاتک جو موسیقی میں ہندی زبان کی مشہور کتاب ہے اسکا ترجمہ اسی نے فارسی زبان میں کیا، مولوی غلام علی آزاد بلگرامی ید بیضا میں اسکے حالات کے ذیل میں لکھتے ہیں،

"در عہد عالمگیر بادشاہ از ولایت ایران بہ ہند آمدہ و در سلک منصبداران شاہی انتظام داشت وباوجود آنکہ بہ ہند آمدہ زبان این ولایت آموخت، امابواسطہ حدت ذہن در نظم ہندی طبع او آن قدر دخیل شد کہ از جملہ استادان فن برآمد، زبانش بہ تلفظ این زبان خوب میگردید امانظم بسیار پختہ واقع میشد، و در ہندی تھمی تخلص میگرد، ترجمہ پارجاتک در فن قصہ نغمات ہندی از دست"

عالمگیر ہی کے متوسلین میں ایک اور شاعر دانا تخلص تھا، اسکی نسبت مولوی غلام علی آزاد بلگرامی ید بیضا میں لکھتے ہیں،

"در نظم ہندی بسیار خوب گفتہ"

بھاشائی زباندانی اور شاعری کا ذوق اس زمانہ میں اسقدر عام ہوا کہ بڑے بڑے علما اور حضرات صوفیہ اس میں کمال پیدا کرتے تھے، شیخ غلام مصطفےٰ متخلص بہ انسان بہت بڑے پایہ کے شخص گذرے ہیں، وہ قوم کے کمبوہ اور مراد آباد کے رہنے والے تھے، معقولات کی تحصیل حضرت ملا قطب الدین شہید سہالوی (جد مولانا بحر العلوم) کی خدمت میں کی، حدیث کا فن محدث دہلوی کے خاندان سے حاصل کیا، تصوف میں شیخ جان محمد شاہجہان آبادی کے مرید تھے، طب، نجوم، خوشنویسی، فن جنگ ان تمام چیزوں میں کمال رکھتے تھے، عالمگیر کے زمانے میں منصب داری کے عہدہ پر مامور ہو کے دکن گئے، لیکن چند روز کے بعد استعفا دیکر چلے آئے ۱۱۴۲ھ میں بمقام اوجین وفات پائی،

ہندی زبان اور بھاشا کی شاعری میں ان کا جو درجہ تھا، اسکا اندازہ مولوی غلام علی آزاد کی عبارت ذیل سے ہو سکتا ہے،

"علم ہندی بمرتبہ کہ اکثر براہمہ برہمن حل غوامض از خدمت شیخ میکردند و شعر ہندی نیز خوب میگفت عندلیب شعرائے ہندی در حضور او سر فرود می آوردند و اصلاح گرفتہ ورد و ہمیگر گفتند" (سرو آزاد)

عبد الجلیل بلگرامی، مولوی غلام علی آزاد کے نانا، جو عالمگیر کے درباری تھے ہندی زبان کے ممتاز شاعر تھے، فارسی قصیدوں میں بھی کہیں کہیں بھاشا بول جاتے ہیں، چنانچہ ایک قصیدہ میں لکھتے ہیں،

ہمیں ما ٹیکے سکے ہندوی مین بون بہت رہے جگت میں اچل باس پیہ زیر سدا

یہ ذوق اسقدر ترقی کرتا گیا کہ محمد شاہ کے زمانے میں جب راجہ جے سنگھ والی جے پور نے جیں لاکھ کے صرف سے رصد خانہ قائم کیا اور فن ریاضی کے ساتھ نہایت اہتمام کیا تو علماے اسلام نے اسکے حکم سے شرح چغمینی اور ہیئت کی اور کتابوں کا ترجمہ بھاشا زبان میں کیا، چنانچہ آزاد سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں،

وقد نقل العلماء الا ھاند بامر جی سنگھ شرح الجغمینی وغیرہ من کتب الھیئۃ والھندسۃ من العربیۃ الی الھندیۃ، سبحۃ المرجان صفحہ ۱۲	ہندوستان کے علما نے جے سنگھ کے حکم سے شرح چغمینی وغیرہ کتابوں کو جو علم ہیئت اور ہندسہ میں تھیں، عربی زبان سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا۔

شرح چغمینی اس درجہ کی مشکل کتاب ہے کہ اردو میں اسکا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا، اس سے قیاس کرنا چاہیئے کہ جو علما بھاشا زبان میں اس کا ترجمہ کر سکے، انکی بھاشا دانی کا کیا رتبہ ہوگا؟ اسی زمانے میں سید نظام الدین بلگرامی نے سنسکرت اور بھاشا کے علم ادب میں نہایت شہرت حاصل کی، سنسکرت کے حاصل کرنیکے لیئے بنارس کا سفر کیا اور وہاں رہکر اس علم کی تکمیل کی، ہندی موسیقی میں اس درجہ کا کمال پیدا کیا کہ لوگ انکو نایک کہتے تھے، چنانچہ اس فن کے متعلق بھاشا میں دو کتابیں تصنیف کیں، ناد چندرکا اور مدھنایک سینگار، بھاشا میں مدھنایک تخلص کرتے تھے، سنہ ۱۱۹۰ھ میں وفات پائی کلام کا نمونہ یہ ہے۔

جو چتر ان چیت چڑھے، نہ بڑھے، بدہ بیدن، اگر نھ نہ گا سے

فرشتہ دل ترکیب صورت، عقلا، کتب آسمانی، قدیم کتابیں

بہار بتی، بھوری کری بھرین، جبپ، جوگن، جوگ ابھپہ گناے
گویائی سمجھائی ریاضت مرتاض

جو مکھ جوت جگی، نہ تہکی مدھنایک، گھونگھٹ چنچل تاے
چہرہ روشنی نام شاعر شوخی

جھنین، دوکول، چھپے، جھلگی اپچھ براجت اچھ رجھاے
باریک دوپٹہ زیب دنیا بے مثل فریفتہ کرنا

مطلب یہ ہے کہ تیری آنکھیں نقاب کے اندر جس قدر خوشنما ہیں، اسکی خوبی فرشتوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتی، اور نہ آسمان کی کتابوں میں انکی توصیف پائی جاتی ہے، قوت نطق خود محو حیرت ہے، اور زاہد مرتاض سبحہ گردانی سے بھی زیادہ اسکا مداح ہے، نقاب ان آنکھوں کی خوبی کو چھپا نہیں سکتی بلکہ باریک دوپٹہ اسکی خوبی اور بھی دوبالا کر دیتا ہے ان کا اور بہت سا کلام سرو آزاد میں نقل کیا ہے، لیکن چونکہ ناظرین کیلئے وہ نامانوس صدا ہوگی، اس لیئے ہم اسکو قلم انداز کرتے ہیں،

سید رحمت اللہ پسر سید خیر الدین بلگرامی، بھاشا زبان کے مشہور استاد تھے سلطنت کی طرف سے دو صدی منصب اور جاگیر مقرر تھی، اس زمانے میں بھاشا کا مشہور شاعر چنتامن ایک ہندو تھا، اسکا ایک شاگرد رحمت اللہ کا شہرہ سنکر انکی خدمت میں حاضر ہوا، اور چنتامن کا دوہہ اُنکے سامنے پڑھا،

ہیو ہرت ارکرت ات چنتامن چت چین
وا مرگ نینی کی لکھی وا ہی کے سے نین

سید رحمت اللہ نے اس دوہہ میں غلطی نکالی اور چنتامن نے سُنا تو غلطی تسلیم کرکے اسکی اصلاح کردی، چنتامن نے سید رحمت اللہ کی مدح میں ایک دوہہ بھی لکھا جسکا مطلع یہ ہے،

گرب، اگھ، سنگ، جیون، سبل، گل گاج من پربل، گج، باج دل ساج، دھایو
غرور شیر بطور قومی اظہار دلیری زبردست، ہاتھی، گھوڑا، فوج آراستہ حملہ کیا

بجت اِک جمک، گھن گھمک دندبھن کی، ترنگ کھر، دھمک بھوتل ہلایو
ایک طرح پر گردون شگاف نقارہ گھوڑے کا سُم زمین

سید رحمت اللہ نے ۱۳ ربیع الثانی ۱۱۸۰ھ میں وفات پائی، انکے بہت سے دوہے سرو آزاد میں نقل کیئے ہیں، ہم صرف ایک پر اکتفا کرتے ہیں،

کر اُچائے، جمہائے تیہ دھاری نیچ یہ بھائے منو چپلا دوی چمک ہوسے گری بھوم پر آئے
ہاتھ بلند کرنا، انگڑائی بازو خوش نما معلوم ہوئے گویا بجلی زمین

یعنی محبوب نے جمائی لیتے ہوئے جب دونوں ہاتھ اُٹھا کر نیچے کریئے تو یہ معلوم ہوا کہ گویا دو بجلیاں چمک کر زمین پر گر پڑیں،

سید غلام نبی پسر سید محمد باقر، سید عبد الجلیل بلگرامی کے بھانجے تھے، ۲ محرم ۱۱۱۱ھ مین پیدا ہوئے، سید عبد الجلیل اس زمانے میں عالمگیر کے ساتھ دکن کی مہم پر تھے، بھانجے کے پیدا ہونے کی خبر سُنی تو سال تاریخ کی فکر ہوئی اسی حالت میں سو گئے، اور خواب میں یہ مادہ ہاتھ آیا، ع، نور چشم باقر عبد الحمید
تفاول کے طور پر پیشین گوئی کی کہ یہ لڑکا شاعر ہوگا، خدا کی قدرت پیشین گوئی صحیح اُتری، اگرچہ عربی و فارسی میں بھی مہارت رکھتے تھے، لیکن بھاشا کی شاعری میں نہایت کمال پیدا کیا، ۱۱۶۱ھ مین نواب وزیر اور افاغنہ کی لڑائی میں نواب کے ہمرکاب تھے اور عین معرکہ جنگ میں مارے گئے، مولوی غلام علی آزاد سے نہایت درجہ کا اتحاد تھا، چنانچہ آزاد نے تاریخ کہی، ع، رقم کردہ ہے غلام نبی
بھاشا زبان میں ایک دیوان لکھا جسمیں ۱۷۰ دوہے ہیں، اسکا نام انگ درپن رکھا، بھاشا میں اُنکا تخلص رس لین ہے، رس کے معنی بھاشا میں دیدار کے ہیں اور

لین سے معنی محو سے ہین، درس لین کا لفظی ترجمہ محو دیدار ہے، اُسکے کلام کا نمونہ یہ ہے،

(توحید) تیری منور تھ کو ہوت ہی تن لوک توں ہی ہوئی، اکاش، کرت نکہت اودوت ہی

مطلب اشارہ، دُنیا آسمان ستارہ روشنی

(توحید) توں ہی چارو تتو سیل، تر، پس، پنچھی، ہوت توں ہی میگھ پوجی کوت اور اکوت ہی

اربعہ عناصر، پہاڑ، درخت، چرند، پرند، بادل دیتا ہی حساب بے حساب

توں ہی بن ناری بھرتا، کی رسلین، ہوت توں ہی ہوئی کی، ستر یسپ این تین لہت ہی

عورت شوہر محو دشمن

جاگ پڑین جھو نتوں جیوں سپن، لوگ ہوت تیو نہیں آتما بچاری لوگ جاگت کو ہوت ہی

بیداری خواب روح

"یعنی تیرے ہی اشارہ سے دُنیا پیدا ہوتی ہی تو ہی آسمان بنکر ستارونکو روشن کرتا ہی تو ہی اربعہ عناصر اور پہاڑ، درخت، چرند اور پرند بنجاتا ہی تو ہی بادل بنکر بے حساب بارش کرتا ہی تو ہی عورت کے قالب میں آکر مرد کا راحت رسان ہی، تو ہی بالآخر موت کی صورت میں جان کا دشمن ہی تو جسطرح کہ جاگنے کے بعد خواب بالکل وہم معلوم ہوتا ہی اسیطرح خدا شناسوں کے نزدیک یہ دنیا تمام تر خواب ہے"

سید برکت اللہ بہت بڑے فقیہ تھے، بھاشا میں شعر کہتے تھے اور پیمی تخلص کرتے تھے، بھاشا میں اُنکی نظموں کا مجموعہ ہی اس کا نام خود پیم پرکاس رکھا تھا، سرو آزاد میں اُنکا بہت سا کلام نقل کیا ہی، ہم صرف ایک دوسے پر اکتفا کرتے ہین،

چکھ جوگی کنتھا گرین، ارن، سیام اور سیت

آنکھ گلا سرخ سیاہ سفید

آنسو بوند سیمرن لین درسن بھچا ہیت

قطرہ تسبیح دیدار حیران

"یعنی آنکھیں ایک ریاضت کش جوگی ہین جو سرخ، سیاہ اور سفید دانوں کا مالا پہنے ہوئے

اور آنسوؤں کی تسبیح لیئے ہوئے دیدار کی بھیک کی طالب ہیں،،

ان بزرگوں کے سوا اور بہت سے اہل کمال گذرے ہیں، جنھوں نے بھاشا زبان کی انشاپردازی اور شاعری میں ناموری حاصل کی، اور جنکے حالات مختلف تذکروں میں مل سکتے ہیں، کیا ان واقعات کے بعد بھی ہمارے ہندو دوست کا یہ بیان قابل تسلیم ہے کہ مسلمانوں نے کبھی ہندو لٹریچر پر توجہ نہیں کی اور جو کرنا چاہتا تھا، وہ کافر قرار پاتا تھا، ہمارے ہندو دوستونکو یاد رکھنا چاہیئے کہ مسلمانوں سے زیادہ بے تعصب قوم، نہ صرف دُنیا کی پچھلی تاریخ بلکہ موجودہ اور آیندہ زمانہ بھی قیامت تک پیش کرسکے گا،

موبدانِ مجوس

(ہندوستان میں)

مسلمانوں کا تاریخی سرمایہ جو بہت کچھ مفقود ہوچکا، اور ہوتا جاتا ہے اسنے علاوہ اور بہت سے نقصانات کے سب سے بڑا نقصان یہ پہونچایا، کہ خود مذہب اسلام کے متعلق دُنیا کو عجیب عجیب غلطیاں اور بدگمانیاں پیدا ہوگئیں، اور ہوتی جاتی ہیں، یہان تک کہ اب خود مسلمان بھی ان غلطیوں سے بچ نہیں سکتے، وہ بھی مذہب کی حقیقت وہی سمجھتے ہیں، جو معلومات کے مفقود ہونے نے کئی سو برس سے قائم کردی ہے،

اہل یورپ کا خاصہ ہے کہ وہ ہم زمان واقعہ کو عمومًا علت و معلول فرض کرلیتے ہیں مثلاً جب تاریخ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے، کہ اسلام کے بعد ایرانیوں کا لٹریچر برباد ہوگیا تو وہ قطعی طور سے فیصلہ کرلیتے ہیں کہ یہ اسلام ہی کے طرز عمل کا نتیجہ تھا،

اسی طرح جب وہ دیکھتے ہین، کہ ہندوستان کی کسی اسلامی تاریخ مین پارسی قوم کے معابد کا، پیشوایان مذہبی کا، تصنیفات کا، تعلیم و تلقین کا، پتہ نہیں چلتا، تو انکو یقین ہوجاتا ہے، کہ سلاطین ہندوستان نے تعصب کی وجہ سے یا تو سرے سے انکے

مُلک میں گھسنے نہ دیا، یا ایسی حالت میں رکھا، کہ انکی کوئی امتیازی حیثیت قائم نہ رہی جس سے انکے متعلق کسی قسم کی کوئی اطلاع حاصل ہو سکتی،

لیکن اصل حقیقت یہ ہی کہ یہ جو کچھ ہے، تاریخی کم مائگی کا ثبوت ہی، ہم اس مضمون مین پارسیوں کے پیشوایان مذہبی (جنکو موبد کہتے ہیں) کا مختصر حال لکھنا چاہتے ہیں، جو ہندوستان میں سکونت رکھتے تھے، اور جنکی تصنیفات، و تالیفات، وسعت کے ساتھ اہل علم میں پھیلی ہوئی تھیں اور چونکہ انکے یہ حالات اسلامی ہی تصنیفات سے لیئے گئے ہیں، اسلیئے اس سے یہ بھی ظاہر ہوگا، کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کے لٹریچر اور تاریخ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے!

سلطنت تیموریہ میں سب سے پہلے اکبر کے زمانے میں موبدونکا پتہ چلتا ہی، اکبر نے جس زمانے میں، مذہبی کانفرنس قائم کی، اور ہر مذہب و ملت کے پیشوا دُور دُور سے بلائے، تو ایران سے بھی خط کتابت کی، اس زمانے میں پارسیوں کا پیشوائے اصل، آذر کیوان تھا، اسنے آنے میں معذرت کی، لیکن ایک عجیب و غریب کتاب اپنی تصنیف بھیجی، جسکی نسبت صاحب مآثر الامرا لکھتے ہین،

"نامہ از مؤلفات خود کہ مشعر ستائش مجردات و کواکب و متضمن نصائح و حکم بود، فرستاد مشتمل چہار جزء ہر سطرش پارسی بحت بود، تصحیف آن عربی و چون قلب می کردند ترکی و بار تصحیف آن ہندی می شد"[۱]

یعنی اس کتاب میں یہ کمال تھا، کہ خالص فارسی میں تھی، لیکن اگر نقطوں کو ادل بدل کر پڑھو، تو عربی ہو جاتی تھی، اور الفاظ کو اُلٹ کر پڑھو تو ترکی، اور پھر مصحف کرنے سے ہندی ہو جاتی تھی[۲]

---

[۱] مآثر الامرا جلد دوم صفحہ ۳۸۵،

[۲] یہ مضمون زیادہ تر بلکہ قریباً کل، دبستان مذاہب سے لیا گیا ہی، اس کتاب کی نسبت مشہور ہے کہ محسن فانی کشمیری کی تصنیف ہی، بعض اسکو دارا شکوہ کیطرف منسوب کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہی، کہ ذوالفقار

اگرچہ اس نا ممکن صنعت پر ہم یقین نہیں کر سکتے، لیکن اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں، کہ آذر کیوان نے اپنی کوئی تصنیف ضرور بھیجی تھی،

آذر کیوان نے تو آنے سے انکار کیا، لیکن ایک دوسرا موبد جس کا نام اردشیر تھا، حسب طلب آیا، اور اپنے ساتھ مذہبی آتشکدہ کی آگ بھی لیتا آیا، چنانچہ اسکی حفاظت اور اہتمام شیخ ابو الفضل کے سپرد کیا گیا، یہ مآثر الامرا کی روایت ہے، لیکن دبستان مذاہب کے مصنف نے صاف تصریح کی ہے کہ آذر کیوان ہندوستان میں آیا، اور عظیم آباد پٹنہ میں سکونت کی، اور ۱۰۲۷ھ میں ۸۵ برس کے سن میں انتقال کیا،

ممکن ہے کہ یہ آذر کیوان وہ نہ ہو جس کا ذکر مآثر الامرا میں ہے بلکہ کسی اور موبد کا نام ہو، بہر حال یہ آذر کیوان، اسفندیار کے خاندان سے تھا، دبستان میں اسکا پورا شجرہ نسب لکھا ہے، بچپن ہی سے وہ مرتاض اور گوشہ نشین تھا، ۱۸ برس خم میں بیٹھا، علوم و فنون میں یہ کمال حاصل کیا، کہ لوگ اسکو ذو العلوم کے لقب سے پکارتے تھے عربی زبان کا بھی ماہر تھا، فقہا اور صوفیہ اس سے ملتے رہتے تھے، اور ان سے پُر لطف صحبتیں رہتی تھیں، ایک دن کسی فقیہ نے پوچھا، کہ آپ جانوروں کے مارنے سے کیوں منع کرتے ہیں، بولا کہ جو لوگ کعبہ کا احرام باندھتے ہیں، اُنکو جانور کا مارنا حرام ہے دل بھی کعبہ ہے، اس لئے جو لوگ اس کا احرام باندھتے ہیں، انکو جانوروں کا مارنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے،

ایک دن ایک شخص نے آذر کیوان سے کہا کہ میں سوداگر تھا، رہزنوں کے ہاتھ سے تنگ آکر درویشی اختیار کی، آذر کیوان نے کہا، کہ اب تم خود رہزنی کروگے،

آذر کیوان کی تصنیفات سے جام کیخسرو کا ذکر دبستان میں کیا ہے، اور اسکے اشعار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸) اردستانی کی تصنیف ہے، جیسا کہ مآثر الامرا جلد دوم صفحہ ۳۹۲ میں مذکور ہے، سب سے پہلے یہ کتاب بمبئی میں ۱۲۶۲ھ میں چھاپی گئی، اسکے بعد اور بہت سے مطابع میں چھپی،

سلہ مآثر الامرا، جلد دوم صفحہ ۳۸۵

بھی نقل کیئے ہیں، جو ذیل میں درج ہیں۔

چو زابدانہا برگذشتم روان ... رسیدم بسوی پاک فرخ روان
بدانستم از بودنیہا ہمہ ... شدم باسروفش بزرگ رمہ
در و چون ایسی برتر ہی یافتم ... فروغی زیزدان ہمی تافتم
چو بگذرد و پرتو برفت این منی ... سروشی بتابید اہرمنی
خدا بود و از من نشانی نہ بود ... فراموش و یاد و روانی نہ بود
ہمہ راز خود سایہ می یافتم ... بہ ہوش سروشان ہمی تافتم
زخوشان ہمی تافتم بر زوال ... چنین تا بہ اندام ہا نیز خوان
توانا و دانا و دالا بدم ... چنین تا از ان پایہ زیر آمدم
بدان رہ کہ رفتم شدم موی تن ... بصد ایزدی فرہ زان انجمن
خداوند را پایہ زان برترست ... کہ آمیزش بندہ را درخورست
زدریای ہستیش گیتی نمی ... نمم نم بگو چیست بودش ہمی
زمہر او نوازش کند بندہ را ... کہ برداشتن شاید افگندہ را
گدا را تونگر کند مہر او ... جہان پرتوی از خود چہر او
مرا و را چہر او کس نیار د شنود ... کہ او در نیاید بگفت و شنود

آذر کیوان کے تلامذہ کثرت سے تھے، انہیں سے چند ممتاز شاگرد جن سے صاحب دبستان نے ملاقات کی تھی، اور اُنکی صحبت سے فائدہ اُٹھایا تھا، انکے نام اور مختصر حالات درج ذیل ہیں،

خراد اِس کا مورث اعلیٰ نوشیروان کی خوان سالاری کا منصب رکھتا تھا، خراد نے شیراز میں آذر کیوان کی شاگردی اختیار کی، اور ایک مدت تک سخت ریاضتیں اُٹھائیں سنہ ۱۰۲۹ھ میں انتقال کیا،

"فرشیدورد" یہ بھی شیراز میں آذر کیوان کے فیض سے مستفید ہوا اور ہندوستان
میں سنہ ۱۰۲۹ھ میں وفات پائی،

خردمند، سام نریمان کے خاندان سے تھا مصنف دبستان پٹنہ میں ان بزرگوں
سے ملا تھا، چنانچہ خود لکھتا ہے، اگر و آورنامہ در پٹنہ این چہار آزادہ یعنی خباد، فرشیدورد،
و بہمن، و خردمند را دیدہ دعائے خیر در بارہ نامہ نگار بجا آوردند،

بہرام ابن فرہاد گودرز کے خاندان سے تھا، آذر کیوان جس زمانے میں پٹنہ میں
تھا، بہرام، شیراز سے چلکر پٹنہ میں آیا، اور تکمیل نفس میں بڑی محنتیں اٹھائیں، اسنے
فلسفہ کی تمام شاخوں میں کمال حاصل کیا، اور ان فنون میں عربی، پہلوی اور فارسی، زبانوں
کی تصنیفات سے واقفیت حاصل کی تھی، عربی فلسفہ کی کتابیں، خواجہ جمال الدین محمود
سے، جو علامہ دوانی کے شاگرد تھے پڑھی تھیں، تجارت کے ذریعے سے بسر کرتا تھا،
سنہ ۱۰۳۴ھ میں بمقام لاہور وفات پائی،

بہرام کی تصنیفات میں سے تین کتابیں زیادہ مشہور ہیں، شارستان دانش،
گلستان بینش، شارستان،

مصنف دبستان نے پارسیوں کے عقاید و خیالات، اکثر انہیں کتابوں سے لیئے ہیں،

ہوشیار، سورت میں پیدا ہوا، رستم کے خاندان سے تھا نہایت راست باز،
دلیر، صاحب تدبیر و مقدمہ فہم تھا، آذر کیوان کی صحبت اٹھائی تھی، ایک ایک پہر تک
حبس نفس کر سکتا تھا، کھانے پینے میں کسی چیز سے پرہیز نہیں تھا سنہ ۱۰۵۰ھ میں بمقام
آگرہ وفات پائی سرود مستان اسکی تصنیف ہے،

موبد سروش زردشت کی نسل سے تھا، عربی اور فارسی کے ساتھ ہندی
زبان بھی جانتا تھا، عربی بہرام بن فرہاد سے حاصل کی تھی، تمام عمر شادی نہیں کی گوشت
بھی نہیں کھاتا تھا، اسکی تصنیفات کثرت سے ہیں، مثلاً نوشدارو، سبکتگین، زردشت

افشار وغیرہ، محمد محسن ایک فاضل کا بیان ہے کہ میں نے خدا کے ثبوت میں ۲۶۰ دلیلیں اسکی زبان سے سنیں، لیکن قلمبند کرنا چاہا تو نہ کر سکا، اکثر خوارق عادات اس سے صادر ہوتے تھے مصنف دبستان نے سنہ ۱۰۳۶ھ میں اس سے بمقام کشمیر ملاقات حاصل کی تھی،

خداجوئی ہرات کا باشندہ تھا، مدت تک جویائے حق رہا، آخر خواب میں ہدایت ہوئی کہ آذر کیوان سے فیض حاصل ہوگا، چنانچہ موبد خوشی کے ساتھ اصطخر گیا، آذر کیوان کے حلقہ میں شامل ہوا، عربی اور فارسی زبان میں مہارت کامل رکھتا تھا، اکثر چپ رہتا تھا، اور لوگوں کے اصرار سے گفتگو کرتا تھا، آذر کیوان کی مشہور کتاب جام کیخسرو کی شرح لکھی، سنہ ۱۰۴۰ھ میں بمقام کشمیر وفات پائی، مصنف دبستان نے یہیں اس سے ملاقات حاصل کی تھی،

موبد خوشی ایک مدت تک حق کی تلاش میں تمام دنیا میں پھرتا رہا، آخر آذر کیوان کی خدمت میں پہونچا، اور اس سے مقامات سلوک تحصیل کیئے، اسکی تصنیفات سے زمگاہ ایک مفید کتاب ہے جسمیں اسنے آذر کیوان کے بارہ شاگردوں کے حالات اور واقعات لکھے ہیں، ان شاگردوں کے یہ نام ہیں، اردشیر، خراد، شیرویہ، خردمند، فرہاد، سہراب، ازادہ، بیژن، اسفندیار، فرشیدورد، بہمن، رستم، مصنف دبستان نے آذر کیوان کے شاگردوں کے حالات زیادہ تر اسی کتاب سے لکھے ہیں!

بہرام بن فرشاد ارژنگ مانی اسکی تصنیف ہے، آذر کیوان کا شاگرد تھا، لیکن تکمیل بہرام کی خدمت میں کی، سنہ ۱۰۴۸ھ میں بمقام لاہور وفات پائی، شیخ شہاب الدین مقتول سہروردی کی تصنیفات جو فلسفہ اشراق سے متعلق تھیں، ان کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا، ایک عجیب بات یہ ہے کہ عربی، فارسی، اور ہندی کے علاوہ یورپ کی بعض زبانیں بھی جانتا تھا، اکثر کتابت کا شغل رکھتا تھا، اور نہایت قلیل الغذا تھا، مصنف دبستان کا بیان ہے

کہ میں نے سنہ ۱۰۴۸ھ میں اسکو لاہور میں دیکھا تھا، ایک رات دن متصل دو زانو ایک مقام پر بیٹھا رہا، اور ذرا جنبش نہ کی،

"موبد پرستار، پٹنہ میں پیدا ہوا، بچپن میں آذر کیوان کی صحبت اٹھائی، اور زیادہ تر فیض موبد سروش سے حاصل کیا، پتره سوبدی اسکی تصنیف ہی،

شیدوش ابن انوش، زردشت کے خاندان سے تھا اس کا باپ آذر کیوان کا تربیت یافتہ تھا، نہایت خوش لباس تھا، اور بڑے کروفر سے زندگی بسر کرتا تھا، خوبرو اور وجیہ تھا سنہ ۱۰۴۷ھ میں کشمیر میں بیمار ہوا، اور یہیں وفات پائی، نزع کی حالت میں حضرت نور بخش کے یہ اشعار پڑھنے شروع کیے،

یکی قطره ام از محیط وجود	اگرچند داریم کشف و شهود
من از قطره کی گشته ام بس نفور	خدایا رسانم به دریای نور

اخیر شعر پر دم نکل گیا۔

مصنف دبستان نے اس کا مرثیہ لکھا جسکے چند شعر یہ ہیں،

شیدوش تازه دیدهٔ من بر کرانه شد	گرچشم خانه بود به سر رو خانه شد
آرام گاه طائر قدسی سپهر بود	زین پست آشیان به فراز آشیانه شد
جانش بذات حضرت جان آفرین رسید	بیرون ز قید چرخ و زمین و زمانه شد

یہ تمام موبد جن کا ذکر ہوا، آذر کیوان کے شاگرد اور تربیت یافتہ تھے مصنف دبستان نے اور موبدوں کے نام بھی لکھے ہیں، ہمنے انکو قلم انداز کیا،

مسلمانوں کی بے تعصبی کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوگا کہ بہت سے مسلمان فضلانے آذر کیوان کی شاگردی اختیار کی، اور چونکہ وہ موحد اور صوفی تھا، اس لیے سلوک کے مقامات اس سے طے کیے، انمیں محمد علی شیرازی، محمد سعید اصفہانی، عاشور بیگ، محمد بیگ کا حال مصنف دبستان نے تفصیل سے لکھا ہی، لوگوں کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ شیخ بہاء الدین

عالی نے بھی، آذر کیوان کی صحبت سے فیض اُٹھایا، سچ ہی -

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت
دانہ می چیدم من آن روزی کہ خرمن داشتم

المعتزلہ والاعتزال

اسلام کے اُن بہت سے فرقوں سے جنکی تعداد کو ایک پیشین گوئی کے پورا کرنے کے لیے (۷۳) تک پہونچایا گیا ہے، صرف چار فرقے ہیں جنکو زیادہ تر کامیابی ہوئی اور جو مدت تک موجود رہے یعنی سُنی، شیعہ، معتزلہ، باطنیہ، انمیں سے دو آخرالذکر آج کل بالکل معدوم ہیں، معتزلہ اگرچہ دُنیا سے ناپید ہو گئے، لیکن ایک مدت تک ان کو بہت عروج رہا بڑے بڑے نامور مصنفین انمیں پیدا ہوئے، مشہور خلفاء اور سلاطین نے فخریہ اِس لقب کو اختیار کیا، متعدد علوم اِسی فرقے کی بدولت عالم وجود میں آئے غرض وہ خود اگرچہ دُنیا میں نہیں رہے، لیکن مذہب میں، علم میں، تصنیف میں، لٹریچر میں انکی بہت سی یادگاریں اب بھی موجود ہیں، اور زمانہ اُن کو آئندہ بھی مٹا نہیں سکتا، البتہ یہ افسوس ہے کہ انکے مٹنے کے ساتھ انکی تاریخ بھی مٹتی جاتی ہے اور ایک ایسے مشہور فرقہ کے واقعات کا معدوم ہوجانا تاریخی دُنیا کا بہت بڑا افسوس ناک حادثہ کہا جا سکتا ہے، اس لحاظ سے خیال ہوا کہ معتزلہ کے متعلق ایک مختصر سا مضمون جسمیں مذہب اعتزال کی ابتدا اور اُسکی اشاعت، عہد بعہد کی ترقیاں، ترقی و تنزل کے اسباب مشہور معتزلیوں کے مختصر حالات، اعتزال کے مسائل اور ان پر ریویو، دوسرے فرقوں پر اس مذہب کا اثر، یہ اور اس قسم کے اُمور لکھے جائیں، اس مضمون کا یہ پہلا ٹکڑا ہی جس میں اعتزال کی اجمالی تاریخ ہی۔

اعتزال اگرچہ اور مذاہب کیطرح صحابہ کے اخیر زمانہ میں پیدا ہوا لیکن اسکے ابتدائی آثار عین شروع اسلام میں موجود تھے، حقیقت یہ ہے کہ اُن مذاہب میں سے کسی مذہب کی نسبت خصوصیت کے ساتھ یہ کہنا کہ وہ فلاں زمانے میں پیدا ہوا ایک قسم کی ناانصافی ہے، یا تو یہ کہنا چاہیئے، کہ ابتدائے اسلام یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کے زمانے میں، تسنن تشیع، اعتزال، قدر، کوئی مذہب موجود نہ تھا، یا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ تمام مذاہب اُسی زمانے میں پیدا ہو چکے تھے، آنحضرتؐ کے زمانے تک اسلام ایک نہایت اجمالی اور سادہ چیز تھی، یعنی عقاید میں کلمہ توحید، اور اعمال میں فرائض خمسہ، عقاید کی سادگی آنحضرت کے بعد بھی کچھ زمانے تک قائم رہی، کیونکہ آنحضرت کے انتقال کے ساتھ روم و فارس کی مہمات شروع ہو گئیں اور عرب کی دماغی اور عملی قوت کا سارا زور مہمات ملکی کی طرف مصروف ہو گیا، اِن معرکہ آرائیوں میں کلمہ توحید کا اجمالی مسئلہ تو ہمیشہ تازہ رہا کیونکہ جن قوموں پر حملے کیے جاتے تھے، انکے سامنے جنگ سے پہلے یہی مسئلہ پیش کیا جاتا تھا، لیکن وہ اِسی حد تک تھا کہ خدا ہے، یہ تفصیل اور باریک بینیاں کہ ہے تو کیا ہے؟ اسکے صفات کیا ہیں، اسکی قدرت کے کیا حدود ہیں؟ وغیرہ وغیرہ، اسوقت نہ پیدا ہوئیں اور نہ ہو سکتی تھیں،

تاہم صحابہ میں چونکہ ایک گروہ ایسا بھی تھا جو علمی اشغال میں مصروف تھا اور جسکو مہمات ملکی سے بہت کم تعلق رہتا تھا۔ اسلیے عقائد میں کسی قدر بحث و تدقیق شروع ہو گئی، اور مختلف فرقوں کے وجود کی گویا بُنیاد قائم ہوئی، صحابہ کے زمانے تک عقائد میں جو اختلافات پیدا ہوئے انمیں سے چند یہ ہیں۔

اکثر صحابہ معراج جسمانی کے قائل تھے حضرت عائشہ کو اس سے انکار تھا عبد اللہ ابن عباس کا مذہب تھا کہ رسول اللہ نے خدا کو دیکھا تھا حضرت عائشہ اسکی منکر تھیں، عبد اللہ ابن عمر سماع موتی کے قائل تھے، بعض صحابہ اسکے سخت مخالف تھے،

ابوہریرہؓ کا عقیدہ تھا کہ عزیزوں کے نوحہ کرنے سے مردہ پر عذاب ہوتا ہی حضرت عائشہؓ اسکے مخالف تھیں،

عقائد سے متعلق تو انھیں چند مسائل میں اختلاف ہوا لیکن اعمال چونکہ محسوس پیرایہ رکھتے تھے، اور روزانہ ان سے کام پڑتا تھا اسلیے اُنمیں نہایت کثرت سے اختلافات پیدا ہو گئے بعض اختلافات جو وضو اور نماز کے مسائل کے متعلق تھے انکی تفصیل یہ ہی،

عبداللہؓ بن عباس،	وضو میں اعضا کو ایک بار دھونا چاہیے،
ابوہریرہؓ،	دو دو بار،
ابوہریرہؓ،	آگ پر پکی ہوئی چیز کے استعمال سے وضو ٹوٹ جاتا ہی،
جابرؓ،	نہیں ٹوٹتا،
عائشہؓ،	نماز فجر منہ اندھیرے پڑھنی چاہیے،
رافعؓ بن خدیج،	اسفار کرنا چاہیے،
عائشہؓ	عصر میں جلدی کرنی چاہیے،
ام سلمہؓ،	تاخیر کرنی چاہیے،
انسؓ بن مالک و ابن عمرؓ،	اقامت اکہری کہنی چاہیے،
عبداللہؓ بن زید،	دوہری چاہیے،
علیؓ و ابن عباس و ابوہریرہ،	فجر میں قنوت پڑھنا چاہیے،
ابومالک اشجعی،	نہیں،
ابوبکرؓ، عمرؓ، انسؓ، ابودرداؓ،	مسح علی العمامہ جائز ہے،
بعض دیگر صحابہ،	نہیں،
اکثر صحابہ،	مسح علی الخفین جائز ہی،
عائشہؓ و ابن عباس،	جائز نہیں،

لیکن عقائد اور اعمال کے ان اختلافات نے کسی قسم کا محسوس تفرقہ نہیں پیدا کیا، سب لوگ ایک لقب یعنی مسلمان کے نام سے پکارے جاتے تھے، ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے. دوستانہ ملتے جلتے تھے، حضرت علیؓ کے اخیر زمانہ یعنی ۳۷ھ میں جب اُنھوں نے امیر معاویہؓ سے صلح کر لی اور حکم کا فیصلہ تسلیم کر لیا، تو خود انکے ساتھیوں میں سے کئی ہزار آدمی ان سے الگ ہو گئے کہ لا طاعۃ لغیر اللہ یعنی مذہب کے حق و باطل کا فیصلہ ثالث اور حکم کی رائے پر نہیں ہو سکتا، یہ پہلا فرقہ تھا جو اسلام میں قائم ہوا، کیونکہ ان لوگوں نے تمام مسلمانوں سے جو انکی رائے سے موافق تھے ہر طرح کی علیحدگی اختیار کی، اور انکا عقیدہ تھا کہ جو شخص انکا ہم عقیدہ نہیں وہ مسلمان نہیں، اس مناسبت سے یہ لوگ حضرت علیؓ کے دائرہ سے خارج ہو گئے، انکا نام خارجی مشہور ہوا، اس امتیازی نام سے اس بات کی ابتدا ہوئی کہ اختلاف آرا کی بنا پر جدا جدا فرقے قائم ہوں اور انکے جدا جدا نام رکھے جائیں؛

یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ اگرچہ تمدن کی وسعت کا خود اقتضا یہ تھا کہ اسلام کے مجمل عقائد روز بروز وسیع ہوتے جائیں اور نئے نئے فرقے قائم ہوں، لیکن پہلے وہی فرقے قائم ہوئے جنکو پالیٹکس سے بھی کچھ لگاؤ تھا، خارجیوں کی ابتدا اسی حیثیت سے ہوئی شیعہ کا فرقہ تو گویا پولیٹیکل فرقہ تھا، قدریہ مذہب جو ان دونوں کے بعد پیدا ہوا اور جو مذہب اعتزال کی اصلی بنیاد ہے وہ بھی پولیٹیکل حیثیت سے خالی نہ تھا، سب سے پہلے قدر کی نسبت جس نے گفتگو کی وہ معبد جہنی تھا، یہ بنو امیہ کا زمانہ تھا، اور استحکام سلطنت کیلئے ہمیشہ خونریزیاں کی جاتی تھیں، ملک میں ان مظالم کی وجہ سے نہایت ناراضی پھیلی ہوئی تھی، اور چونکہ اسوقت تک عرب میں آزادی کا مادہ باقی تھا، وہ متعجب ہو کر افسران سلطنت سے پوچھتے تھے کہ تم مسلمان ہو کر ان خونریزیوں کو کیونکر جائز رکھتے ہو، انکی طرف سے جواب ملتا تھا کہ ہم کچھ نہیں کرتے جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے، الناس مجبورہ مقہورہ، معبد جہنی بھی

اُنھیں لوگوں میں سے تھا، چنانچہ ایک دفعہ حسن بصری کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس مسئلہ سے متعلق انکی رائے دریافت کی، اُنھوں نے کہا کہ ''کذب اعداء اللہ'' یعنی دشمنان خدا (بنی اُمیہ) جھوٹے ہیں۔[۱]

جیسا کہ ہمنے اوپر بیان کیا ہے، اور مذاہب کیطرح اعتزال کے ابتدائی آثار بھی خود آنحضرتؐ اور صحابہ کے زمانے میں موجود تھے صحابہ میں سے اگرچہ بہت سے ایسے تھے جو مذہبی مسائل سے متعلق کچھ غور کرنا نہیں چاہتے تھے یا عقل کو دخل دینا نہیں چاہتے تھے لیکن ایسے بھی تھے جو ہر بات کو عقل کے معیار سے جانچتے، یا کم سے کم کہ یہ عقل کو معاملات شرعیہ میں بیکار نہیں خیال کرتے تھے، یہی اعتزال کی اصلی بنیاد تھی جس پر آگے چل کر بڑی بڑی عمارتیں قائم ہوئیں؛

اعتزال کا سب سے پہلا مسئلہ جو مذہب اعتزال کی تاریخ کا آغاز ہے یہ تھا کہ انسان جو بُرائیاں کرتا ہے، خدا نہیں کراتا، اس مسئلہ کو قدر کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ معتزلیوں کا دوسرا نام قدریہ بھی ہے، اسی مناسبت سے وہ اپنا لقب عدلیہ رکھتے تھے، کیونکہ خدا کا عادل ماننا اس بات پر موقوف ہے، کہ انسان کو اپنے افعال کا مختار مانا جائے، اور معتزلہ ایسا ہی مانتے تھے، اس مسئلہ کو سب سے پہلے معبد جہنی نے شائع اور مشتہر کیا اور اسیوجہ سے قدریہ کے لقب سے مشہور ہوا، چونکہ اعتزال اور قدریہ کے اُصول پالٹیکس سے بھی ایک خفیف تعلق رکھتے تھے، اور معبد علانیہ حکومت بنی اُمیہ کو بُرا کہتا تھا عبدالملک بن مروان نے ۸۰ھ ہجری میں حجاج کے ہاتھ سے اسکو قتل کرا دیا،[۲]

معبد کے بعد غیلان دمشقی نے جو قبطی النسل تھا، اس مسئلہ کی ترویج کی، اسکے ساتھ چند اور مسائل بھی مذہب اعتزال میں شامل کر لئے، جنمیں ایک امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی تھا، یہ مسئلہ حکومت کیلئے ایک پُرخطر مسئلہ تھا اور چونکہ غیلان نہایت بیباکی سے اس

[۱] معارف ابن قتیبہ صفحہ ۲۲۵ [۲] مقریزی جلد دوم صفحہ ۳۵۶

کا اعلان کرتا تھا، ہشام بن عبد الملک نے جو ۱۰۵ھ میں تخت نشین ہوا، دمشق میں بُلا کر اسکو پھانسی دیدی،

معبد و غیلان نے جو ارکان اعتزال تھے، اگرچہ بہت کم زمانہ پایا لیکن ملتنے ہی عرصے میں اعتزال کو بہت ترقی ہوگئی، سیکڑون۔ ہزارون آدمیون نے یہ مذہب قبول کرلیا، اور اسکے بڑے بڑے اصول مرتب ہو کر قلمبند ہو گئے،

اِسی زمانے میں دو شخصوں نے جو اتفاق سے ایک ہی سنہ یعنی ۸۰ھ میں پیدا ہوئے تھے اس مذہب کو زیادہ رونق دی، یعنی عمرو بن عبید اور واصل بن عطا یہ دونوں حسن بصری کے شاگرد تھے، اور انکے حلقہ درس میں جو بصرہ کی مسجد میں منعقد ہوا کرتا تھا اکثر شریک ہوا کرتے تھے، اُن دنوں خوارج سے اِس مسئلہ کا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے، بہت چرچا تھا حسن کی مجلس میں اسکا ذکر آیا تو واصل نے کہا کہ میں ایک تیسری شق اختیار کرتا ہوں وہ یہ کہ مرتکب کبائر نہ مسلمان ہے نہ کافر، اسپر حسن نے سخت ناراضی ظاہر کی واصل و عمرو بن عبید دونوں انکے پاس سے اُٹھکر چلے آئے، اور اسی مسجد میں اپنا ایک حلقہ درس قائم کیا حسن کے حلقہ سے الگ دیکھکر لوگوں نے انکو معتزلہ کہنا شروع کیا اور اس لقب کے ایجاد کا یہ پہلا دن ہے،

یہ دونوں مذہب اعتزال کے دست و بازو اور فضل و کمال کے چشم و چراغ تھے، واصل عرب کے نہایت مشہور بلیغوں میں شمار کیا گیا ہے اسکی قادر الکلامی کی ایک مثال یہ ہے کہ چونکہ وہ الثغ تھا یعنی اسکی زبان سے رکا حرف نہیں ادا ہوتا تھا، اسلیئے جو کچھ دیتا یا کوئی عبارت لکھتا یا بولتا عموماً (ر) سے خالی ہوتی تھی، علم کلام کا پہلا موجد وہی ہے اصول اولین اسی نے بیان کیئے، علامہ ابو ہلال عسکری نے کتاب الاوائل میں بہت سے اولیات اسکی طرف منسوب کیے ہیں، چنانچہ لکھا ہے کہ ملحدوں کا رد اول اِسی نے لکھا مسائل فقہیہ کے چار ماخذ، قرآن، حدیث، اجماع، قیاس، اول اسی نے قرار دیئے،

عام وخاص کی اصطلاح اول اسی نے قائم کی، یہ مسئلہ کہ "نسخ احکام میں ہوسکتا ہے نہ اخبار میں" اول اسی نے بیان کیا، علامہ ابن خلکان نے اسکی بہت سی تصنیفات کے نام گنائے ہیں، جو نہایت عمدہ مضامین پر لکھی گئی ہیں،

عمرو بن عبید کمالات علمی کے علاوہ نہایت زاہد وعابد اور دنیا سے بے نیاز تھا، حسن بصری سے ایک شخص نے اسکی نسبت سوال کیا، تو انھوں نے کہا، تم ایسے شخص کی نسبت پوچھتے ہو، جسکو گویا، فرشتوں نے ادب سکھلایا ہے اور انبیا نے اسکی تربیت کی ہے، میں نے اس سے زیادہ کسی کے ظاہر کو باطن کے ساتھ موافق نہیں پایا[1]، خلیفہ منصور عباسی کے دربار میں اسکا آنا اور نہایت بے نیازی اور آزادی سے گفتگو کرنا نہایت دلچسپ واقعہ ہے، جس کا تذکرہ تمام مورخین نے کیا ہے، اسکے مرنے پر خود مرثیہ لکھا، اہل تاریخ کا بیان ہے کہ یہ شرف یعنی خلیفہ وقت کا مرثیہ لکھنا، عمرو بن عبید کے سوا دنیا میں کسی کو حاصل نہیں ہوا، غرض واصل اور عمرو کی نکتہ آفرینی سے مذہب اعتزال نے نہایت وسعت پیدا کی، عدل وقدر کے علاوہ اور بہت سے دقیق مسائل مذہب اعتزال میں شامل ہو گئے، ملک میں ان مسائل کا زیادہ چرچا ہوتا گیا یہانتک کہ رفتہ رفتہ اسنے دربار خلافت میں بھی بار پایا، یزید بن ولید بن عبد الملک نے علانیہ یہ مذہب قبول کیا اور جب ولید بن یزید نے جو ۱۲۵ھ میں تخت نشین ہوا تھا زیادہ عیاشی اور عیش پرستی شروع کی تو یزید ناقص نے امر بالمعروف کے دعوے سے جو اعتزال کے مسائل کا پانچواں اصول تھا اشتہار جنگ دیا اور بہت سے معتزلہ اسکے ساتھ ہو گئے، یزید نے فتح حاصل کی اور ولید کو قتل کرا دیا، حکومت کا پایہ تھام کر اعتزال نے اور زیادہ ترقی کی، ولید نے ۱۲۶ھ میں وفات پائی اور اسکے بعد ۱۳۲ھ میں دولت بنو امیہ کا خاتمہ ہو گیا[2]،

---

[1] ابن خلکان ترجمہ عمرو بن عبید،

[2] یزید کا اعتزال اور معتزلین کا اسکا ساتھ دینا مسعودی نے یزید کے حالات میں بیان کیا ہے،

دولت عباسیہ کا دوسرا بادشاہ منصور اگرچہ خود کسی خاص مذہب کے انتساب سے مشہور ہونا نہیں چاہتا تھا لیکن چونکہ عمرو بن عبید سے جسکا ذکر اوپر گذر چکا، بچپن کی دوستی تھی اور دونوں مدت تک ایک ساتھ تحصیل علم کرتے رہے تھے اسکے علاوہ عمرو بن جبیر کی بے ریا خدا پرستی اور زہد و قناعت کا وہ دل سے معترف تھا، خود بخود اسکے عہد میں اعتزال کو ترقی ہوئی، واصل بن عطا نے تمام اسلامی ممالک میں اپنے نقیب بھیجدیئے کہ مذہب اعتزال کی منادی کریں، عبداللہ بن الحارث کو مغرب بھیجا اور بہت سے لوگوں نے مذہب اعتزال پر بیعت کی، حفص بن سالم کو خراسان روانہ کیا، وہاں جہم بن صفوان سے جو مذہب جہمیہ کا بانی ہی مناظرہ ہوا اور جہم نے زک پائی، ایسطرح ایوب کو جزیرہ، حسن بن زکوان کو کوفہ، عثمان طویل کو آرمینیا بھیجا، آرمینیہ میں بہت سے لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا،

ان واقعات کے سوا ایک نہایت قوی سبب اور پیدا ہوا جس نے اعتزال کا سکہ بٹھا دیا منصور نے سلطنت کے استحکام سے مطمئن ہوکر علوم و فنون کی اشاعت پر توجہ کی اور پہلوی، سریانی، یونانی، ہندی زبانوں سے حکمت و فلسفہ کی کتابیں ترجمہ کرائیں سلطنت کے اثر سے ان ترجموں کو نہایت قبول حاصل ہوا، اور ملک میں فلسفیانہ مذاق کی گرم بازاری ہوگئی، یہود، عیسائی، پارسی، جو حکومت کی رعایا تھے، اُنھوں نے اسطرف زیادہ توجہ کی اور ساتھ ہی اسلام کے مسائل پر نکتہ چینیاں شروع ہوگئیں، منصور نے تلوار کے زور سے اسکو روکنا مناسب نہ سمجھا، بلکہ بحث کی عام اجازت دیدی، غیر مذہب والوں کے مقابلہ میں محدثین اور فقہا اپنی روایات لیکر آئے وہاں منقولات سے کیا کام چلتا تھا، آخر معتزلہ میدان میں آئے کہ ہم مذہب کو دلائل عقلی سے ثابت کر سکتے ہیں، چنانچہ اُنھوں نے اکثر معرکوں میں غیر مذہب والوں کو شکست دی، یہ دیکھکر کہ حمایت اسلام کیلئے مذہب اعتزال زیادہ کام آسکتا ہی ملک کے ممتاز لوگو نکو اعتزال

سلہ ملل و نحل ملا احمد بن مرتضیٰ،

کیطرف زیادہ توجہ ہوئی اور سیکڑوں ہزاروں آدمی معتزلی بنگئے، منصور کے بعد مہدی نے مذہبی آزادی کو روک دیا، مہدی کا خلف الرشید ہارون الرشید بھی اگرچہ فلسفہ و حکمت سے بے بہرہ تھا، تاہم چونکہ دربار برمکیون کے ہاتھ مین تھا اور وہ انتہا درجہ کے آزاد خیال اور علم دوست تھے اعتزال کا قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھتا جاتا تھا اخیر مین فقہا کے اشارہ سے ہارون نے مناظرہ کی مجلسین قطعاً بند کرا دینؔ اور ساتھ ہی معتزلہ کی ترقی بھی گویا رُک گئی، لیکن جب مامون تخت نشین ہوا تو اس کمی کا پُورا معاوضہ ملگیا، مامون نے خود مذہب اعتزال قبول کیا اور تمام بڑے بڑے معتزلی علما دربار مین باریاب ہوئے، ابو الہذیل علاف و نظام مامون کے اُستاد تھے اور مامون انکا نہایت ادب و احترام کرتا تھا، علاف و نظام دونون فلسفہ و حکمت کے بڑے اُستاد تھے، مامون کہا کرتا تھا، اظل ابو الهذیل علی الکلام کاظلال الغمام علی الانام یعنی ابو الہذیل نے علم کلام پر اسطرح سایہ کیا ہی جسطرح بادل آدمی پر سایہ کرتا ہی،

ہارون کی روک ٹوک اور فقیہانہ تعصب نے غیر قومونکو یہ یقین دلا دیا تھا کہ مذہب اسلام عقل کے مقابلہ مین ٹھہر نہین سکتا یہ بدگمانی یہانتک بڑھی کہ غیر مذہب والونکو عام خیال پیدا ہو گیا کہ اسلام، دُنیا مین جو پھیلا وہ تلوار کے زور سے پھیلا، مامون نے یہ سُنکر ایک عظیم الشان مناظرہ کی مجلس قائم کی تمام اطراف مُلک سے ہر مذہب و ملت کے پیشوا طلب کیے، فرقۂ مانویہ کا رئیس مذہب جس کا نام یزدان بخت تھا رے سے طلب ہو کر آیا ہر شخص کو نہایت آزادی سے گفتگو کرنے کی عام اجازت دیگئی، مسلمانونکی طرف سے مامون نے ابو الہذیل علاف کو مقرر کیا، چنانچہ ابو الہذیل علاف نے یزدان بخت کو بالکل ساکت کر دیا اور میدان مسلمانون کے ہاتھ رہا،[۲]

---

[۱] کتاب الفہرست ابن الندیم،

[۲] الملل و النحل لاحمد بن مرتضیٰ ذکر مامون،

مامون نے تمام اضلاع میں مناظرہ کی مجلسیں قائم کین اور ہر مذہب و ملت کے آدمیونکو بحث و مناظرہ کی اجازت دی، ان مجالس مین ہر جگہ معتزلی ہی ممتاز نظر آتے تھے، اور در حقیقت اسوقت انکی وجہ سے اسلام بڑے صدمے سے محفوظ رہگیا، ابو الہذیل علاف کی خوبی تقریر اور زور کلام کیوجہ سے تین ہزار سے زیادہ آدمی اسلام لائے۔ ابو الہذیل و نظام نے مذہب اعتزال میں چند نئے اصول اضافہ کیے، جنکی تفصیل آگے آئیگی۔

مامون کے بعد معتصم اور معتصم کے بعد واثق تخت پر بیٹھا، یہ دونوں معتزلی تھے اور انکی وجہ سے اعتزال کو زیادہ قوت حاصل ہوئی، معتصم اور واثق کے دربار میں قاضی احمد بن ابی داؤد جو قاضی القضاۃ تھے تمام سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ یعنی ملک کا کوئی انتظام انکی مرضی کے خلاف نہیں ہو سکتا تھا۔ قاضی صاحب معتزلی تھے اور صرف ایک واسطہ سے واصل بن عطا کی شاگردی کا شرف رکھتے تھے۔ ان کے زمانہ میں اعتزال کو وہ زور حاصل ہوا کہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ واثق کے بعد اگرچہ متوکل نے تعصب مذہبی کیوجہ سے ہر قسم کی عقلی ترقی روک دی۔ لیکن تمام اسلامی ممالک مین یہ مذہب جڑ پکڑ چکا تھا۔ اور متوکل کے مٹانے سے مٹ نہ سکتا تھا۔ چنانچہ چوتھی صدی تک اعتزال کو پوری قوت حاصل رہی۔ اور بڑے بڑے متکلم، مفسر، ادیب پیدا ہوئے جنکی تصنیفات ابتک بڑے پایہ کی خیال کی جاتی ہیں۔ سب کے اخیر ابو علی جبائی تھا جس نے ۳۰۳ھ ہجری میں وفات پائی۔ اور سب کے بعد اس درجہ کا کوئی امام الاعتزال نہیں پیدا ہوا۔

اسلامی ممالک میں سے اسپین میں فلسفہ اور عقلیات کو عوام نہایت ناپسند کرتے تھے۔ یہانتک کہ اگر کوئی شخص فلسفہ کے نام سے منسوب ہوتا تھا تو بازار میں اُس کا نکلنا مشکل ہوتا تھا۔ حکیم ابن رشد اسی جرم میں جلاوطن کیا گیا۔

شام میں بھی فلسفہ و عقلیات کو کبھی ترقی نہیں ہوئی۔ اس لحاظ سے اِن دونوں ملکوں میں اعتزال کا رواج نہ پانا محل تعجب نہیں۔ ہندوستان کا بھی قریباً یہی حال ہے۔

کئی سو برس تک یہاں عقلی علوم کا قدم نہیں آیا تیموریوں کے زمانہ سے منطق و فلسفہ کی بنیاد پڑی۔ لیکن اسوقت مذہب اعتزال خود ناپید ہو چکا تھا جسکی وجہ آگے آئیگی۔

چوتھی صدی کے آغاز میں ابوالحسن اشعری کا نشو و نما ہوا، یہ ابو علی جبائی کے شاگرد تھے اور مدت تک معتزلی رہے۔ ایکدن ایک مسئلہ میں جو اعتزال سے تعلق رکھتا تھا اُنھوں نے جبائی کو بند کر دیا۔ اور پھر اعتزال سے توبہ کر کے سُنّی اور شافعی ہو گئے۔ فقہا اور محدثین جو فلسفہ اور منطق سے بالکل نا آشنا تھے اور اس وجہ سے معتزلیوں سے ہمیشہ جھپکتے تھے۔ ان کو ابوالحسن اشعری نہایت غنیمت معلوم ہوئے انھوں نے انکو نہایت تپاک سے لیا۔ اور اُنکی تصنیفات کو جو زیادہ تر مذہب اعتزال کی رد میں تھیں تمام ملک میں پھیلا دیا۔ چونکہ ان تصنیفات میں جابجا قرآن اور حدیث کے حوالے تھے اس لئے عام لوگوں میں انکا بہت رواج ہو گیا۔ اور معتزلہ کا زور کم ہونا شروع ہوا۔ تاہم چوتھی صدی کے اخیر تک کوئی صوبہ بلکہ ضلع اور پرگنہ و شہر معتزلہ کے وجود سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ علامہ بشاری نے جس نے چوتھی صدی میں دنیا کا سفر کیا مقامات ذیل کے متعلق معتزلہ کی نسبت یہ تفصیل لکھی ہے،

عرب	سرداۃ اور حرین کے سواحل اور خصوصاً عمان کے تمام باشندے معتزلی ہیں۔
عراق	معتزلہ یہاں بھی ہیں لیکن حنبلیوں اور شیعوں کو غلبہ ہے۔
اقور	موضع عانہ میں کثرت سے معتزلی ہیں۔
مصر	و نطاط میں معتزلہ کا بڑا زور ہے۔
خراسان	دیہات میں زعفرانیہ بہت ہیں (زعفرانیہ درحقیقت اعتزال کی ایک شاخ ہے)
فارس	معتزلہ اور شیعہ کثرت سے ہیں۔

کرمان   سیرجان میں اکثر معتزلہ ہیں۔

خوزستان   اس ملک میں تمام دنیا کی بہ نسبت معتزلی زیادہ ہیں۔

امام ابوالحسن اشعری نے ۳۳۰ھ ہجری میں انتقال کیا۔ ۳۸۰ھ ہجری میں انکے مذہب نے عراق میں ترقی کرنی شروع کی پانچویں صدی میں چند بڑے بڑے نامور علما مثلاً قاضی ابوبکر باقلانی۔ بن فورک۔ ابواسحاق اسفرائینی۔ ابواسحق شیرازی امام غزالی نے اس مذہب کی تائید اور نصرت میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ اور معتزلہ کی تکفیر و تفسیق کی۔ چونکہ اسوقت عباسیوں کی سلطنت برائے نام رہگئی تھی اور سلجوقیہ وغیرہ کی وجہ سے مذہبی آزادی بالکل باقی نہیں رہی تھی۔ اشعری مذہب کے رواج کے ساتھ اعتزال کے جبراً مٹانے کی کوشش کی گئی۔ معتزلیوں پر ہر طرح کا ظلم کیا جاتا تھا اور انکو اپنے خیالات کے اظہار کی جرات نہیں ہو سکتی تھی۔ محمد بن احمد جو بہت بڑے معتزلی عالم گذرے ہیں اور ۴۷۸ھ ہجری میں انتقال کیا پچاس برس تک گھر سے باہر نہیں نکل سکے۔ علامہ زمخشری جنکی تفسیر کشاف گھر گھر پھیلی ہوئی ہے چونکہ معتزلی تھے اپنے ملک میں چین سے رہنے نہیں پاتے تھے۔ مجبوراً مکہ چلے گئے چنانچہ اپنی تفسیر میں ایک موقع پر اسکا اشارۃً ذکر کیا ہے۔

امام غزالی جس زمانہ میں بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں مدرس تھے محمد بن تومرت مراکش سے آکر انکا شاگرد ہوا اور ان سے اشعری عقاید سیکھے۔ بغداد سے واپس جاکر اس نے سلطنت کی بنیاد ڈالی اور اوسکی وفات کے بعد عبدالمومن بن علی جو اسکا جانشین ہوا تمام مغرب اور اندلس کا بادشاہ بنگیا محمد بن تومرت نے اشعری کے عقاید عبدالمومن کو حوالہ کردئے تھے۔ اس نے اپنی تمام سلطنت میں اسکو رواج دیا اور حکم دیدیا کہ ان عقیدوں کا جو منکر ہو وہ قتل کردیا جاوے چنانچہ سخت خونریزی کے بعد تمام اسپین اور مغرب میں اشعری کے سوا اور کسی فرقہ کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔

سلہ مقریزی صفحہ ۳۵۸ جلد ثانی۔ سلہ مقریزی صفحہ ۳۵۰

سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس نے بچپن میں قطب الدین مسعود نیشاپوری سے تعلیم پائی تھی اور وہ اشعری المذہب تھے۔ سلطان صلاح الدین کو جب حکومت حاصل ہوئی تو اس نے تمام حکومت میں بجبر اشعری عقاید جاری کروئے[1]۔

ساتوین صدی میں مغلوں اور ترکوں نے بغداد اور بغداد کے ساتھ اور بڑے بڑے شہرون بلکہ مسلمانوں کے تمام عقلی اور دماغی قوی کا استیصال کر دیا۔ مدت تک تو یہ تمام ممالک ویران پڑے رہے۔ ترکوں کے مسلمان ہو جانے کے بعد دوبارہ نشو ونما شروع ہوا۔ لیکن وہ عقلی ترقیان پھر عود نہین کر سکتی تھیں۔ ترک قلم کی بہ نسبت تلوار سے زیادہ کام لیتے تھے۔ اور چونکہ چھٹی صدی کے بعد تمام اسلامی دنیا یعنی ہند، خراسان، فارس، عراق، مصر، شام، ایشیائے کوچک، قسطنطنیہ وغیرہ میں ہر جگہ ترک ہی ترک تھے اسلیے وہ نازک اور دقیق مذہب جو تلوار کی بہ نسبت قلم سے زیادہ مناسبت رکھتا تھا دوبارہ زندہ نہو سکا۔ مذہب اعتزال کی ابتداء ترقی اور تنزل کا یہ نہایت اجمالی خاکہ ہے۔

---

[1] مقریزی صفحہ ۳۵۰۔

علوم جدیدہ

علم کی حقیقت

علوم جدیدہ کے مسائل بعض ایسے ہیں جو بالکل حال کی ایجاد ہیں، اگلے زمانے میں ان کا نام ونشان تک نہ تھا بعض ایسے ہیں جو پہلے بھی موجود تھے لیکن آج انکی تشریح جسطرح کیجاتی ہے اگلوں نے نہیں کی تھی، اس سلسلہ کی ابتدا ہم پہلے اسی قسم کے ایک مسئلہ سے کرتے ہیں، کیونکہ اس سے قدیم وجدید کے موازنہ کا موقع بخوبی ملسکتا ہے۔

علم کی حقیقت یونانیوں نے یہ بیان کی تھی کہ کسی چیز کی صورت جو ذہن میں حاصل ہوتی ہے اسکا نام علم ہے، اسکے متعلق حصولی۔ حضوری۔ حصول اشیاء بانفسہا اور باشباحہا کی طول طویل بحثیں تمام متداول کتابوں میں مذکور ہیں۔

حکمائے حال نے علم کی جسطرح تشریح کی ہے اسکی تفصیل حسب ذیل ہے،

انسان کو خدا نے مختلف حواس دئے ہین اور ہر حواس کے مدرکات جدا ہین، قوت سامعہ صرف آواز کو محسوس کرتی ہے، اجسام یا رنگ اور خوشبو وغیرہ کو ادراک نہیں کر سکتی، شامہ، آواز صورت کا احساس نہین کر سکتی،

اکثر چیزین مختلف چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہین جو مختلف حاسون سے محسوس ہوتے ہین، مثلاً شہد میں لزوجیت ہے جسکو لامسہ محسوس کرتا ہے۔ رنگ ہے جو آنکھ سے محسوس ہوتا ہے، خوشبو ہے جسکو شامہ سے تعلق ہے وزن ہے جسکا ادراک لامسہ کی استعانت سے ہوتا ہے،

جب ہم کسی چیز کو مختلف حواس سے محسوس کرتے ہین تو جو کیفیتیں محسوس ہوتی ہین

وہ ہمارے حافظہ کے خزانہ میں جمع ہوتی ہیں، اب ان میں سے جب کسی ایک کا احساس ہوتا ہے تو اس چیز کی باقی کیفیتیں ہمکو یاد آجاتی ہیں مثلاً ہم نے کسی وقت شہد کو دیکھا چکھا۔ اور سونگھا تھا، اس سے شہد کی نسبت ہمارے حافظہ میں تین کیفیتیں جمع ہوئیں، رنگ، مزہ، خوشبو، اب فرض کرو کہ ہم نے دُور سے شہد کو دیکھا اور اُسکی خوشبو یا مزہ ہمکو محسوس نہیں ہوا، تاہم اسکا مزہ اور خوشبو خود بخود ہمکو یاد آجائیگی، اس بنا پر احساس اور ادراک کے متعدد مدارج ہیں،

احساس کے مدارج (۱) محض احساس بالفعل مثلاً ہم ایک سیب کو دیکھ رہے ہیں (۲) احساس سابق اور احساس بالفعل دونوں، مثلاً ہم نے شہد کو دیکھا اور اسکا مزہ جو پہلے ہمنے چکھا تھا اسوقت یاد آگیا، تو اُسکی رنگت کا ادراک موجودہ احساس کے ذریعہ سے ہی، اور مزہ کا ادراک گذشتہ احساس کی یاد ہی (۳) محض تصور مثلاً ہمنے شہد کو کبھی سونگھا اور چکھا تھا، اب شہد ہمارے سامنے نہیں ہی لیکن ہمکو وہ یاد آگیا، اور اسکے ساتھ اسکا رنگ مزہ، خوشبو سب یاد آگئی، تو ان میں سے کوئی چیز موجود بالفعل نہیں، بلکہ احساس سابق کا تذکرہ ہے اور اس لحاظ سے اسوقت ہمکو شہد کا محض تصور ہی تصور ہی۔

یہاں یہ نکتہ خاص لحاظ کے قابل ہی کہ جو علم احساس بالفعل سے حاصل ہوتا ہے وہ قطعی اور یقینی ہی اور جسمیں گذشتہ احساس سے کام لینا پڑتا ہی وہ یقینی نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہی کہ گذشتہ احساس کی یاد میں ہمنے غلطی کی ہو۔ ادراک اور احساس کی نوعیت کے متعلق ایک عام غلطی کیجاتی ہی کہ جب ہم مثلاً سیب کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ مجکو سیب کا علم ہوا، تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ علم بدیہی ہے، کیونکہ بالذات حواس ظاہری کے ذریعہ سے حاصل ہوا ہے لیکن اسمیں غلطی یہ ہی کہ سیب کا علم یہاں صرف حواس سے نہیں حاصل ہوا ہی، حواس نے صرف رنگت اور شکل محسوس کی ہے، باقی اُسکا مزہ اور خوشبو تو چونکہ اسکا احساس پہلے ہو چکا تھا اسلیے ہمنے قیاس کر لیا کہ جب صورت

اور رنگ وہی ہے تو مزہ اور خوشبو بھی وہی ہوگی اسلیے محسوس بالفعل صرف شکل اور رنگ ہے، باقی گذشتہ محسوس کی یاد ہے، اب جبکہ ہمارے سامنے سرے سے ایک شے موجود نہو لیکن اُس کے مختلف آثار ہم پہلے محسوس کرچکے ہوں اور اسلیے اُس کا خیال ہمارے ذہن میں آئے تو یہ تصور ہوگا، اس بنا پر تصور کی تعریف یہ ہوگی کہ کسی شے کے گذشتہ احساسات کی یاد،

تصور کی تعریف

ان بیانات سے ثابت ہوگا کہ تصور کی تعریف جو یونانیوں نے کی تھی یعنی کسی شے کی صورت جو ذہن میں حاصل ہو وہ کئی لحاظ سے غلط ہے،

یونانی تعریف کی غلطیاں

پہلی غلطی تو یہ ہے کہ ذہن یا عقل کوئی مادی شے نہیں جسمیں صورت کا انعکاس یا انطباع ہو، دوسری غلطی یہ ہے کہ تصور کے وقت کوئی نئی صورت حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایک حاصل شدہ صورت کا تذکرہ ہوتا ہے، ہمارے حافظہ میں بہت سے معلومات ہیں، جب ہم اُنکی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ہمنے انکا تصور کیا، اب اگر تصور کی حقیقت وہ ہو جو یونانی بیان کرتے ہیں تو معنی یہ ہونگے کہ اُسوقت کوئی نئی صورت حاصل ہوئی ہے حالانکہ اسوقت کوئی نئی صورت حاصل نہیں ہوئی بلکہ جو صورت پہلے سے حاصل تھی اُسی کیطرف ہمارا ذہن متوجہ ہوا ہے، کیونکہ کسی شے کی صورت حاصل اُسوقت ہوتی ہے جب وہ شے ہمارے حواس کے سامنے موجود ہو،

اس مسامحت کی وجہ یہ ہے کہ کسی شے کی حاصل شدہ صورت، کی یاد دلانیکا بڑا ذریعہ رُوئیت ہے اور رویت میں اشیا کی صورت آنکھ کے پردہ میں منطبع ہوتی ہے، اس لیے احساس بصری میں جو صورت حاصل ہوتی ہے وہ تصور نہیں بلکہ تصور کی پیدا کرنیوالی ہے، لیکن یہ تمام ادراکات یعنی احساس بالفعل، احساس مرکب، تصور محض، سب ادراک کے ابتدائی درجے ہیں، یعنی یہ سب جزئیات کے ادراک کے طریقے ہیں۔

کلیات کا ادراک اسطرح ہوتا ہے کہ ہم بہت سے جزئیات کو دیکھتے ہیں، ان سب

میں بعض چیزیں مشترک پاتے ہیں، یہ قدر مشترک کوئی موجود خارجی نہیں ہی، نہ کسی خاص موجود خارجی سے مطابق ہی لیکن ایک قسم کا وجدان ہی جو بہت سے جزئیات کے دیکھنے اور ان میں سے بعض اوصاف کے مشترک پانے سے پیدا ہوتا ہے، اس وجدان کا نام تعقل ہی اور اسی کو کلیات کا ادراک کہتے ہیں؛

منطق میں جس چیز کو تصور کہا جاتا ہی وہ تصور نہیں بلکہ یہی تعقل ہی کیونکہ تصور کے لئے صورت کی ضرورت ہی، اور کلیات کے ادراک میں کوئی خاص صورت نہیں حاصل ہوتی بلکہ بہت سے جزئیات کے استقصار سے اسطرح منتزع ہوتا ہی کہ ہم افراد کے خصوصیات کو حذف کرتے جاتے ہیں اور ایک مفہوم عام پیدا کر لیتے ہیں، ہم نے زید۔ بکر۔ عمرو کو دیکھا، انکی جو الگ الگ خصوصیتیں تھیں مثلاً قومیت وطن جسمانی ترکیب وغیرہ وغیرہ سب کو حذف کرتے گئے، تو صرف انسانیت ایک ایسی چیز باقی رہی جو سب میں مشترک ہی، یہ انسانیت خارج میں موجود نہیں اور اسلئے وہ کسی حاسہ سے محسوس نہیں ہو سکتی بلکہ جزئیات کے دیکھنے سے منتزع ہوتی ہی، اسلئے اسکو تصور نہیں بلکہ شعور یا تعقل کہا جا سکتا ہی اور چونکہ علم کی یہ اعلیٰ درجہ کی قسم ہی، اسلئے علم کی تعریف یا تو یوں کرنی چاہیئے کہ تصور مع تعقل یا صرف تعقل پر اکتفا کرنا چاہیئے،

ابن رشدؒ

اِس مضمون کے متعلق چند باتیں عرض کردینی ضرور ہیں،

اوّل یہ کہ یہ مضمون تمامتر پروفیسر رینان کی کتاب "سوانح ابن رشد" سے ماخوذ ہے؛

لیکن پروفیسر مذکور نے اس مضمون کو اسقدر وسعت سے لکھا ہی کہ کئی سو صفحوں میں داہوا ہی لیکن اُسوقت میں رینان کی کتاب کی طرف رجوع نہ کرسکا بلکہ الجامعۃ کے ایڈیٹر نے رینان کی کتاب کا عربی میں جو نہایت ناتمام خلاصہ لکھا ہے اسکو مختصر طور پر ادا کردیا ہی، یہ امر خاص طور پر لحاظ کے قابل ہی کہ اس مضمون میں جن یورپین پروفیسروں اور مصنفوں کے نام آئے ہیں، اُنکا تلفظ بالکل بدل گیا ہے جسکی وجہ یہ ہے کہ فرنچ تلفظ انگریزی تلفظ سے بہت مختلف ہے۔ اسپر مزید یہ کہ الجامعۃ کے ایڈیٹر نے ان ناموں کو معرب کرکے لکھا ہے، اور مینے اسکی پیروی کی، فرنچ تلفظ عربی کے قالب میں ڈھلکر انگریزی تلفظ سے بالکل بیگانہ ہوگیا ہے اور انگریزی خوانوں کو یہ نام بالکل اجنبی معلوم ہونگے؛

اس مضمون میں اصلی جو چیز لحاظ کے قابل ہے یہ ہی کہ اگرچہ مسلمان اپنے علوم و فنون اور اپنے اسلاف کی یادگاروں کی پرستش کے دعویدار ہیں، لیکن یہ دیکھکر انکو سخت حیرت ہوگی کہ ابن رشد جسکی تصنیفات کا انکو نام ونشان بھی نہیں ملتا، یورپ میں ایک مدت تک اسکی تصنیفات تمام بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں داخل درس رہیں، اور سیکڑوں اہل فن ان تصنیفات کے شروح حواشی لکھنے میں مصروف تھے اس سے اسبات کا بھی اندازہ ہوگا کہ یورپ نے یونان اور عربی فلسفہ کو اب جو نظر انداز کیا ہے سوچ سمجھکر کیا ہے،

ابوالولید کنیت، حفید لقب، محمد بن احمد بن محمد ابن رشد نام ہے،[1] اِس کا خاندان اندلس میں نہایت معزز خاندان شمار کیا جاتا تھا، اسکا دادا محمد بن رشد سنہ ۵۲۰ ہجری

[1] یہ عجیب بات ہے کہ ابن رشد کے حالات، اسلامی تذکروں اور تاریخوں میں بہت کم ملتے ہیں، ابن ابی اصیبعہ نے

مطابق ۱۰۵۰ء میں پیدا ہوا، علم فقہ میں اس درجہ کمال حاصل کیا کہ قرطبہ دکارڈوا) میں قاضی القضاۃ مقرر ہوا، دُور دُور سے لوگ اُسکے پاس فقہی مسائل کے حل کرنے کے لیئے آتے تھے، ابن فران نے جو قرطبہ کی مسجد جامع کا امام تھا اس کے فتاوی کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کا ایک نسخہ اسپین کی ایک خانقاہ سان فیکتور میں تھا اور اب پیرس کے کتب خانہ میں ہے، شاہی دربار میں اسکو بڑا تقرب حاصل تھا، اور اکثر وہ ملکی معاملات میں دخیل ہوتا تھا، اس زمانے میں مسلمانوں کا حریف مقابل الفونس تھا، جو اکثر اندلس پر حملہ آور ہوتا تھا اور چونکہ خود اندلس کے عیسائی اسکی اعانت کرتے تھے اکثر کامیاب ہوتا تھا، محمد بن رشد نے خاص اس غرض سے ۱۱۲۶ء میں مراکش دمراکو) کا سفر کیا اور سلطان مراکش سے درخواست کی کہ عیسائیون کو اندلس سے جلاوطن کر کے افریقہ میں آباد کرایا جائے، سلطان نے اِس صلاح کو نہایت پسند کیا، اور اس کے حکم سے ہزاروں عیسائی اندلس سے نکل کر طرابلس غرب میں جاکر

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۱ مختصر طور پر اسکا تذکرہ کیا ہے، نفح الطیب میں اس سے بھی زیادہ مختصر ہو، ابن الابار اندلسی نے بھی اجمال سے کام لیا ہو، یہ تمام کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں، ذہبی کی کتاب ہمنے نہیں دیکھی لیکن پروفیسر رینان نے اسکی عبارت نقل کی ہے، اُس میں بھی ایسی تفصیل نہیں جو ابن رشد کے شایان ہو، پروفیسر رینان نے جو فرانس کا نہایت مشہور مصنف گذرا ہو اخاص ابن رشد کے حالات میں ایک ضخیم کتاب فرنچ زبان میں لکھی جسمیں ابن رشد کی سوانح عمری تفصیل سے لکھی، رینان کو بڑا موقع یہ حاصل تھا کہ ابن رشد کے یہودی شاگردوں نے جو کچھ ابن رشد کے متعلق لکھا تھا، وہ اسکے پیش نظر تھا رینان نے ابن رشد کے فلسفہ پر بھی نہایت تفصیل سے بحث کی ہے جسکی وجہ سے کتاب کی ضخامت ۵۰۰ صفحوں سے متجاوز ہوگئی ہے، بیروت کے ایک عیسائی مؤرخ نے اپنی کتاب آثار الادہار میں اسکی مدد سے ابن رشد کا کسی قدر مفصل تذکرہ لکھا ہے، انطون نے ابن رشد کے حالات میں ایک مستقل کتاب عربی زبان میں لکھی جو حال میں اسکندریہ سے شائع ہوئی ہے، لیکن اسکی اصلی غرض ایک مسلمان عالم دشیخ محمد عبدہ) سے مجادلہ کرنا تھا چنانچہ اصل مقصد کو چھوڑ کر ساری کتاب مجادلہ اور مناظرہ سے بھری ہے، اردو زبان میں بھی ابن رشد کے متعلق دو ایک مضمون لکھے گئے، جنمیں سے نواب عماد الملک کا مضمون گو مختصر ہے لیکن چونکہ رینان سے ماخوذ ہے قابل استناد ہے،

آباد ہوئے، محمد بن رشد نے سنہ ۵۲۰ ہجری مطابق سنہ ۱۱۲۶ء میں وفات پائی،

محمد بن رشد کے فرزند احمد نے جو سنہ ۱۰۹۴ء میں پیدا ہوا تھا اپنی ذاتی قابلیت سے اپنے باپ کی جگہ حاصل کی یعنے قرطبہ کا قاضی مقرر ہوا سنہ ۱۱۶۸ء میں وفات پائی اور اپنی یادگار ایک ایسا نامور فرزند چھوڑا جسکی تصنیفات آج اسلام کی سب سے بڑی علمی یادگار ہیں،

ابن رشد سنہ ۵۲۰ ہجری مطابق سنہ ۱۱۲۶ء میں اپنے دادا کی وفات سے ایک مہینہ پہلے بمقام قرطبہ پیدا ہوا، علم چونکہ خاندانی تھا، اسلیے خود اپنے والد سے علوم کی تحصیل شروع کی، موطا جو حدیث کی مشہور کتاب ہے، اسکا راوی اول یحیی صمودی اسپین ہی کا رہنے والا تھا، اور اسوجہ سے موطا کو ان ممالک میں اسدرجہ قبول حاصل تھا کہ قرآن کے بعد شمار کیجاتی تھی ابن رشد کی تعلیم اول اسی سے شروع ہوئی، وہ موطا کو زبانی یاد کرتا تھا، اور اپنے باپ کو سناتا تھا،

حافظ ابو القاسم بن بشکوال، ابو مروان بن مسیرہ، ابو بکر بن سمحون، ابو جعفر بن عبد العزیز اور ابو عبد اللہ مازری سے بھی، حدیث کی تحصیل کی علم فقہ حافظ ابو محمد بن رزق سے حاصل کیا، ادب اور عربیت، اندلس کے نصاب تعلیم کا لازمی جزء تھا، اسلیے نہایت محنت اور شوق سے اسکی تحصیل کی، ابو القاسم بن طلیسان کا بیان ہے کہ ابو تمام اور متنبی کا دیوان اسکو زبانی یاد تھا، اور اکثر صحبتوں میں ان کے اشعار وہ ضرب المثل کے طور پر برجستہ پڑھتا تھا،

ان علوم کی تکمیل کے بعد اسنے طب کی طرف توجہ کی، اس زمانہ میں اس فن کا امام ابو جعفر بن ہارون ترجالی تھا، وہ اشبیلیہ کا رہنے والا تھا، اور وہاں کے اعیان میں گنا جاتا تھا، ابو بکر بن عربی جو امام غزالی کے شاگرد تھے، ان سے حدیث کی تحصیل کی تھی، طب میں نہایت کمال حاصل کیا تھا، ارسطو اور دیگر حکمائے متقدمین کی تصنیفات

کا بڑا ماہر تھا، علوم نظریہ کے ساتھ معالجہ میں بھی کمال رکھتا تھا اور اس تعلق سے سلطان وقت یعنے یوسف بن عبدالعزیز کے دربار کا ملازم تھا،

ابن رشد نے ابو جعفر کی خدمت میں ایک مدت تک طب کی تحصیل کی، طب کے سوا اور علوم بھی اس سے حاصل کیے جسکی تفصیل آگے آئیگی،

اسپین کی علمی حالت اور ابن رشد کی فلسفیانہ تعلیم

عرب مورخ متفق اللفظ ہین، کہ اندلس میں فلسفہ کا پڑھنا پڑھانا عام طور پر نا ممکن تھا اس بنا پر ابن رشد، ابن باجہ جیسے حکما کا اس ملک میں پیدا ہونا اسباب تاریخی کے خلاف ہے، اسلیے پہلے ہم اس عقدہ کو حل کرنا چاہتے ہین،

حقیقت یہ ہی کہ اسپین میں مسلمانون کی علمی زندگی، ممالک مشرقیہ کی نسبت بالکل جداگانہ حالت رکھتی ہی، ممالک مشرقیہ میں علم وفن کی ابتدا دولت عباسیہ سے ہوئی جس کا صدر مقام بغداد تھا، عباسی حکومت کا مایۂ خمیر، پارسی اور عیسائی قومیں تھیں، اور اسوقت تک ان کا ہر قسم کا لٹریچر زندہ موجود تھا، انکی آمیزش سے اسلامی علوم وفنون میں ابتدا ہی سے فلسفہ کا رنگ آگیا اور گو ایک مدت تک فقہا و محدثین، بہت کچھ دامن بچاتے رہے، لیکن آخر مذہب و فلسفہ اس طرح شیر و شکر بن گئے کہ آج عقائد کو فلسفہ سے جدا کرنا ناخن کا گوشت سے جدا کرنا ہی، لیکن اسپین کی حالت اس سے بالکل برخلاف تھی، اسپین میں اسلامی حکومت کی ترکیب بالکل خالص اور بے میل تھی یعنے عرب کے سوا کسی دوسری قوم کا شائبہ نہ تھا، عرب کے قبائل اس کثرت سے وہاں جاکر آباد ہوگئے تھے کہ اسپین حجاز و نجد کا ایک ٹکڑا بن گیا تھا، مفتوحہ قوموں کا کوئی علمی لٹریچر موجود نہ تھا اور تھا تو اسقدر کمزور تھا کہ فاتح لٹریچر پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتا تھا مذاہب میں سے جس مذہب کا یہاں رواج ہوا وہ مالکی مذہب تھا جو عرب کے دل و دماغ کا آئینہ تھا، ان اسباب سے ملک کی آب و ہوا میں عربیت، عربیت میں مذہب اور مذہب میں تصلب اور

تقشف کا اثر آگیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کسی کو فلسفہ و منطق میں مشغول دیکھتے تھے تو زندیق کا خطاب دیتے تھے، اور اکثر اسکی زبان سے کوئی آزادانہ فقرہ نکل جاتا تھا، تو بغیر اس کے حکومت سے چارہ کار کے مستدعی ہوں خود اسکی زندگی کا فیصلہ کر دیتے تھے، علامہ مقری نفح الطیب میں لکھتے ہیں،

کلما قیل فلان یقرء الفلسفۃ اطلقت علیہ العامۃ اسم زندیق وان زل فی شبھۃ رجموہ بالحجارۃ او حرقوہ قبل ان یصل امرہ الی السلطان	جب یہ کہا جاتا تھا کہ فلان شخص فلسفہ پڑھتا ہے، تو عوام اسکو زندیق کہنے لگتے تھے، اور اگر اُسنے کسی شبہہ میں لغزش کھائی تو قبل اسکے کہ بادشاہ کو اسکی خبر پہونچے اسکو پتھر مارتے یا آگ میں جلا دیتے تھے،

بایں ہمہ چونکہ مشرقی ممالک سے علمی تعلقات قائم تھے یعنے تحصیل علوم کے لیے اسپین سے لوگ مشرق کو آتے جاتے رہتے تھے اور یہاں کے اہل کمال نے قدر دانی کی امید پر مغرب کا سفر کیا کرتے تھے، اسپین اور مراکش میں بھی کبھی کبھی فلسفہ کا جلوہ نظر آجاتا تھا۔ سب سے پہلے ان اطراف میں اس فتنہ کا پتہ تیسری صدی ہجری سے چلتا ہے، اسحاق بن عمران بغداد کا ایک مشہور طبیب تھا، وہ زیادۃ اللہ بن تغلب کے زمانہ میں افریقہ گیا، اور وہیں سکونت اختیار کرلی، علامہ ابن اصیبعہ اسکے حال میں لکھتے ہیں کہ یہ پہلا شخص ہے جسکی بدولت بلاد مغرب میں لوگوں نے فلسفہ کو جانا،، اسحق کے شاگرد ابن سلیمان نے ان فنون میں زیادہ کمال حاصل کیا اور الٰہیات میں ایک کتاب لکھی جسکا نام بستان الحکمۃ تھا، منطق میں بھی اسکی ایک تصنیف مدخل کے نام سے موجود ہے،

لیکن ابھی تک یہ فتنہ باہر ہی باہر تھا یعنے خاص اسپین کی حدود اس آشوب سے پاک تھی، یہانتک کہ خلیفۃ الحکم المستنصر لدین اللہ کا زمانہ آیا جسنے اندلس کو تمام دنیا کے علوم و فنون سے معمور کر دیا، وہ سنہ ۳۵۰ھ ہجری میں تخت نشین ہوا اور اس اہتمام سے علوم و فنون کی تربیت پر توجہ کی کہ ہارون الرشید اور مامون الرشید کا نام بھی ماند پڑ گیا،

بلاد مشرقیہ میں ہر ہر جگہ سفیر اور وکیل مقرر کیے کہ جسقدر نایاب کتابیں جہاں سے مل سکیں کتب خانہ شاہی کو روانہ کیجائیں، دولت عباسیہ کا ہنوز علمی شباب تھا تاہم خلیفہ حکم کی رقیبانہ حوصلہ مندیوں کا مقابلہ نہو سکا، اسکی یہ خاص کوشش تھی کہ جو نادر تصنیف ممالک مشرقیہ میں لکھی جائے بغداد سے پہلے اسپین آئے، چنانچہ جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ علامہ ابوالفرج اصفہانی کتاب الاغانی لکھ رہا ہے تو حکم نے قاصدوں سے کتاب کے تمام ہونے سے پہلے ایک ہزار اشرفیاں مصنف کی خدمت میں پیش کیں کہ کتاب کا پہلا نسخہ جو طیار ہو وہ کتب خانہ شاہی کے لیے محفوظ رکھا جائے، اسپین کا خراج اس زمانہ میں پانچ کرور سے زائد تھا باوجود اس کے حکم کے علمی شوق کے لیے کافی نہ تھا، صاحب نفح الطیب لکھتے ہیں،

کان یستجلب المصنفات من الاقالیم	وہ تمام ممالک اور اطراف سے کتابیں بہم پہونچاتا تھا
والنواحی حتی ضاقت عنہا خزائنہ	یہانتک کہ خزانہ شاہی ان مصارف کے لیے تنگی کرنے لگا۔

حکم نے جو کتب خانہ جمع کیا تھا اسکی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف عربی دیوانوں کی تعداد اسقدر تھی کہ فہرست کے ۵۰ صفحے صرف ان کے ناموں کے نذر ہوئے، کل کتابوں کی مجموعی تعداد علامہ مقری نے چار لاکھ بیان کی ہے اس تعداد کی وقعت اس وقت اور زیادہ ہو جاتی ہے جب یہ خیال کیا جائے کہ یہ مجموعہ ہر قسم کے رطب ویابس کا انبار نہ تھا بلکہ زیادہ تر منتخب اور نادرہ روزگار کتابیں تھیں، کیونکہ حکم خود نہایت بڑا مبصر اور نافذ فن تھا، مورخین کا بیان ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی کتاب تھی جو حکم کے مطالعہ میں نہ آئی ہو یا جس پر حکم نے مصنف کتاب کا نسب اور سال وفات نہ لکھا ہو اسکے علاوہ اکثر کتابوں پر اسکے لکھے ہوئے ایسے مفید اور نادر علمی فوائد ہوتے تھے جو حکم کے سوا اور کسی کے قلم سے نکل نہیں سکتے تھے۔

ل؎ یہ حالات نفح الطیب اور پروفیسر رینان کی کتاب سوانح عمری ابن رشد میں تفصیل سے مذکور ہیں ۱۲

اس کتب خانہ مین فلسفہ کی اکثر تصنیفات ممالک مشرقیہ سے منگوا کر جمع کی گئی تھین اور یہ کتابین فلسفہ کی ترویج کا بڑا سبب ہوئیں[۱]،

حکم کے بعد اس کا جانشین ہشام اگرچہ فلسفہ کا دشمن نکلا، اور اسکے بعد ایک مدت تک کسی نے فلسفہ کی سرپرستی نہ کی، لیکن حکم نے فلسفہ دانوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا تھا جسکا سلسلہ اخیر زمانے تک برابر قائم رہا، احمد اور عمر دو حقیقی بھائی سنہ ۳۳۰ ہجری مین تحصیل علم کے لیے بغداد گئے اور سنہ ۳۵۱ ہجری میں یعنے حکم کی تخت نشینی کے ایک برس بعد وہاں سے واپس آئے، حکم نے دونوں کو اپنے خاص درباریوں میں داخل کیا، ایک اور مشہور فاضل محمد بن عبدون الجبلی نے بھی اسی غرض سے سنہ ۳۴۷ ہجری مین ممالک مشرقیہ کا سفر کیا اور ابو سلیمان محمد بن ظاہر بن سیستانی سے جو اس زمانے کا سب سے بڑا منطق دان تھا منطق کی تحصیل کی، وہ سنہ ۳۶۱ ہجری میں اندلس کو واپس آیا اور حکم نے اسکو طبابت کی خدمت دی، حکم کے دربار میں اور بہت سے فلسفہ دان تھے جن میں سے احمد بن حکم بن حفصون اور ابو بکر احمد بن جابر خاص شہرت رکھتے تھے، ان لوگوں نے خود اور بواسطہ اُن کے شاگردوں نے فلسفہ دانوں کا ایک مستقل خاندان قائم کر دیا، یہاں تک کہ ابو عبد اللہ بن الکتانی جسنے سنہ ۴۲۰ ہجری میں انتقال کیا اس نے جب منطق کی تکمیل کرنی چاہی تو محمد بن عبدون جبلی کے علاوہ فلسفہ دانوں کی ایک جماعت کثیر مثلاً عمر بن یونس، احمد بن حکم، ابو عبد اللہ محمد بن ابراہیم القاضی، ابو عبد اللہ محمد بن مسعود، محمد بن میمون، ابو القاسم فید بن نجم، سعید بن فتحون ابو الحارث اسقف، ابو مرین بجائی، موجود تھے، اور ابو عبد اللہ نے ان سب کی شاگردی کا فخر حاصل کیا،

ایک خاص واقعہ جو اس سلسلہ میں لحاظ کے قابل ہے یہ ہے کہ حکم نے مسلمانوں

---

[۱] ابن ابی اصیبعہ ترجمہ ابو عبد اللہ الکتانی،

کے ساتھ یہود و نصاریٰ کی بھی سرپرستی کی، اُس نے اکثر علمائے یہود و نصاریٰ کو دربار میں جگہ دی اور ان کو اس رتبہ تک پہونچایا کہ وہ اپنے مذہبی علوم میں بغداد کے بھی دست نگر نہ رہے ،

ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے کہ حکم کے زمانہ تک اسپین کے یہودی اپنے مذہبی رسوم اور مسائل فقہیہ میں بغداد کے یہود کے محتاج تھے، اور وہیں سے فتوے منگواتے تھے، لیکن جب خلیفہ حکم نے حسدائے بن اسحاق کو جو ایک نامور یہودی عالم تھا دربار میں داخل کیا اور دولت و مال سے مالا مال کر دیا تو اس نے مشرقی ممالک سے زر خطیر صرف کر کے تمام مذہبی تاریخیں منگوائیں اور اسوقت سے اسپین کے یہود بغداد سے بے نیاز ہو گئے ،

حکم کے طرز عمل نے تعلیم کے دائرہ کو نہایت وسیع کر دیا، یعنے مسلمان یہود و نصاریٰ سب میں فلسفہ و معقولات کی تعلیم پھیل گئی، ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان فرقوں میں باہم علمی تعلقات قائم ہو گئے، یہود و نصاریٰ پہلے بھی مسلمانوں کی شاگردی سے عار نہ رکھتے تھے لیکن اب مسلمانوں کو بھی غیر مذہب والوں کی شاگردی سے عار نہ رہا ،

بہت سے نامور علمائے اسلام کے حالات میں تم پڑھو گے کہ وہ طب اور فلسفہ میں عیسائی علما کے شاگرد تھے، ان باتوں سے وسعت علمی کے علاوہ بڑا فائدہ یہ ہوا کہ فلسفہ کو ایک محفوظ جائے پناہ مل گئی، کیونکہ فلسفہ کے تعلم و تعلیم پر جو برہمی ظاہر ہوتی تھی وہ مسلمانوں تک محدود تھی، عیسائیوں اور یہودیوں سے کوئی تعرض نہ کر سکتا تھا اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ حکم کے بعد جب فلسفہ کا کوئی سرپرست نہ رہا اور فلسفہ کی آزادانہ تعلیم بند ہو گئی تو اس کا اثر یہود اور نصاریٰ پر نہ پڑ سکا اور وہ بدستور فلسفہ کی تعلم و تعلیم میں مصروف رہے کیونکہ غیر مذہب والوں کو، اسلامی حکومتوں میں ہمیشہ ہر قسم کی آزادی حاصل رہی اسلیے وہ

سلہ طبقات الاطبا، ترجمہ حسدائے بن اسحاق ؛

جو کچھ چاہتے تھے پڑھتے پڑھاتے تھے، اُن سے کوئی تعرض نہیں کرسکتا تھا،
حکم کے بعد کئی صدیوں تک، فلسفہ شاہانہ عنایت سے محروم رہا، یہاں تک
کہ موحدین کی سلطنت قایم ہوئی یہ سلطنت محمد بن تومرت نے قائم کی تھی جو امام غزالی کا
شاگرد تھا اور بڑا عالم تھا، اسوقت تک اسپین کا شاہی مذہب، فقہ میں مالکی اور عقائد میں
حنبلی یا مجسمی تھا، موحدین کی سلطنت جب قائم ہوئی تو چونکہ بانی سلطنت اشعری تھا
سلطنت کا مذہب بھی اشعری قرار دیا گیا، اشعری مذہب میں امام غزالی کی وجہ سے
معقولات کا کسی قدر رنگ آگیا تھا، اسلیئے فلسفہ کے ساتھ وہ تعصب نہ رہا، عبدالمومن
نے جو اس سلسلہ کا سب سے پہلا بادشاہ تھا، علوم و فنون پر شاہانہ حوصلہ سے توجہ کی اور
عبدالملک بن زہر کو جو اس زمانہ کا بہت بڑا عالم تھا اپنے خاص مقربین میں داخل کیا،
عبدالمومن کے بعد اس کے جانشین یوسف بن عبدالمومن نے جو سنہ ۵۵۸ ہجری میں تخت
نشین ہوا، حکم اور مامون الرشید کا زمانہ یاد دلادیا، وہ خود بہت بڑا عالم تھا، علوم عربیہ
میں کوئی شخص اسکا ہمسر نہ تھا صحیح بخاری زبانی یاد تھی فقہ میں بھی اچھی مہارت رکھتا تھا
ان علوم سے فارغ ہو کر اسنے فلسفہ پر توجہ کی، فلسفہ کی تصنیفات دُور دُور سے
منگوائیں اور ابن طفیل کو جو فلسفہ میں بوعلی سینا کا ہمسر تھا ندیم خاص مقرر کرکے اس خدمت
پر مامور کیا، کہ تمام اطراف و دیار سے علما اور اہل فن طلب کیئے جائیں اور انکو علمی خدمتیں
دیجائیں، ابن طفیل نے جو اہل فن جمع کیئے ان میں ایک ہمارا نامور ابن رشد بھی تھا،
ان واقعات سے تم نے اندازہ کیا ہوگا کہ ابن رشد نے جس زمانہ میں نشو و نما پایا،
ملک میں فلسفیانہ مذاق کا آغاز ہو چکا تھا،

اس کے علاوہ اور متعدد اسباب تھے جنکی وجہ سے اسکو فلسفہ کی طرف رغبت ہوئی
اُس نے جن اساتذہ سے فقہ اور طب کی تعلیم پائی تھی ان میں سے اکثر فلسفہ سے آشنا
تھے، ابوجعفر بن ہارون جسکی خدمت سے اس نے مدتوں استفادہ کیا، علوم عقلیہ کا

بہت بڑا ماہر تھا، ابوبکر بن عربی جو علم فقہ میں اس کے اُستاد اور امام غزالی کے شاگرد تھے، علم کلام کے تعلق کی وجہ سے فلسفہ سے آشنا تھے،

معلوم ہوتا ہے کہ ابن رشد کو ابتدائے تحصیل ہی میں فلسفہ کا شوق پیدا ہو گیا تھا، ابن ابی اصیبعہ نے ابن باجہ کے حال میں لکھا ہے کہ ابن رشد نے اسکی شاگردی کی ہے، ابن باجہ نے ۵۳۳ھ ہجری میں وفات پائی، ابن رشد ۵۲۰ھ ہجری میں پیدا ہوا تھا اس بنا پر ابن باجہ کی وفات کے وقت، ابن رشد کی عمر صرف ۱۳ برس کی تھی،

ابن رشد کی شیوخ فلسفہ میں سے ابن باجہ کے حالات خاص طور پر ذکر کرنیکے قابل ہیں کیونکہ اس سے ابن رشد کی علمی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ابن باجہ کا نام محمد بن یحییٰ بن باجہ ہے، وہ سرقسطہ (سرگوسہ) میں پیدا ہوا اور یہیں اسکی تعلیم و تربیت ہوئی، آغاز شباب ہی میں اسکے فضل و کمال کی یہ شہرت ہوئی کہ ابوبکر بن ابراہیم صحراوی رئیس سرقسطہ نے اسکو اپنا وزیر مقرر کیا، لیکن ابن باجہ کی شہرت جسقدر فلسفیانہ مذاق میں بڑھتی جاتی تھی اسی قدر عوام اسکی طرف سے بدظن ہوتے جاتے تھے اس زمانہ میں امرائے بنوہود اس وصف میں مشہور تھے کہ وہ حکما اور فلاسفہ کی قدردانی کو عوام کی رضامندی پر مقدم رکھتے تھے، ابوبکر کو امرائے بنوہود سے ہمسری کا دعویٰ تھا اسلیے اس نے بھی چند روز تک عوام کی پروا نہ کی لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ اہل فوج تک برہم ہو گئے اور ایک جماعت کثیر ترک ملازمت کر کے چلی گئی، مجبوراً ابن باجہ کو یہ دربار چھوڑنا پڑا اور مراکش جاکر یلتمین کے دربار میں ملازمت اختیار کی یہاں اسکی بہت قدر ہوئی لیکن موت نے جلدی کی اور ۵۳۳ھ ہجری میں انتقال کر گیا، آثار الادھار میں امیر رکن الدین بیبرس کی کتاب زبدۃ الفکرۃ فی تاریخ الہجرۃ سے نقل کیا ہے کہ لوگوں نے حسد سے اسکو زہر دیدیا، یہ روایت صحیح ہو یا نہو لیکن اسقدر مسلم ہے کہ عوام اسکی جان کے دشمن ہو گئے تھے، علامہ ابن ابی صبیعہ لکھتے ہیں کہ۔

بُلِیَ بمحن کثیرۃ وشناعات من العلوم وقصدوا اهلاکه مرات	اسکو بہت سی مصیبتیں پیش آئیں اور عوام اسکو برا بھلا کہتے تھے، اور چند بار لوگوں نے اسکو مار ڈالنے کا قصد کیا

ابن باجہ کو علوم عقلیہ میں جو کمال حاصل تھا اسکے لحاظ سے وہ اندلس کا ارسطو کہا جا سکتا ہے، ممالک مشرقیہ میں بھی، فارابی اور یعقوب کندی کے سوا کوئی اس کا ہمپایہ نہیں پیدا ہوا، علوم و فنون کو اُسنے جو ترقی دی اسکی تفصیل کا یہ موقع نہیں، لیکن اسکو اجمالا ان عنوانون میں بیان کیا جا سکتا ہے،

(۱) ارسطو کی تصنیفات کی شرحین لکھین،

(۲) فلسفہ کی شاخون پر مستقل کتابین لکھین جنمیں اپنی ذاتی تحقیقات درج کین، (ان تصنیفات کا ذکر تفصیل کیساتھ طبقات الاطبا میں موجود ہے،)

(۳) امام غزالی کے برخلاف یہ ثابت کیا کہ علوم نظریہ، ادراک حقایق کے لیے کافی ہین، علوم کشفیہ کی ضرورت نہین،

(۴) موسیقی پر نہایت محققانہ کتاب لکھی، اور بہت سے راگ خود ایجاد کیے،

ابن باجہ نے جس کام کو شروع کیا ابن رشد نے اسکو انجام تک پہونچا دیا، اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ شاگرد نے استاد ہی کی رہنمائی سے اس پُرخطر وادی میں قدم رکھا اور یہ منزل طے کی،

اِس موقع پر یہ واقعہ افسوس کے ساتھ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ ابن باجہ کی تصنیفات سے اسلامی کتب خانے بالکل خالی ہیں البتہ یورپ میں کچھ کچھ پتہ چلتا ہے، منطق میں اسنے جو رسالے لکھے تھے وہ اسپین کے کتب خانہ اسکوریال میں محفوظ ہین، ایک رسالہ جسکا

ابن باجہ کا حال ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے، لیکن نہایت مختصر ہے، آثار البلاد میں تفصیل ہے لیکن اسکا ماخذ مشرقی کتابین نہیں بلکہ یورپ کی تصنیفات ہین، نفح الطیب میں اسقدر لکھا ہے کہ وہ فن موسیقی مین ابو نصر فارابی کا ہمسر ہے، اور اسپین میں جو راگ مشہور ہین اسی کی ایجاد ہین،

نام الوداع ہے اسکا ترجمہ جو یہودیون نے عبرانی زبان میں کیا تھا، فرانس کی پبلک لائبریری
مین موجود ہے، حیوۃ المعتزل اسکی مشہور کتاب خود ناپید ہے، لیکن موسی یہودی نے شرح
رسالہ حی بن یقظان میں اُس سے اکثر فوائد نقل کیے ہین۔

عہدۂ قضا اور دربار سے تعلقات

اوپر گذر چکا ہی کہ ابن رشد کا دادا، قاضی القضاۃ کے منصب پر ممتاز تھا
اس تعلق سے ابن رشد کو آغاز شباب ہی مین قضا کی خدمت مل گئی وہ
اشبیلیہ کا قاضی مقرر ہوا، پھر ابو محمد بن مغیث قاضی قرطبہ کے مرنے پر قرطبہ (کارڈوا)
کے قضا کی خدمت ملی، اِس خدمت کو جس خوبی سے اسنے انجام دیا، اسکی شہرت نے
اسکو دربار شاہی تک پہونچا دیا،

یہ موحدین کی سلطنت کا زمانہ تھا، اور اس سلسلہ کا پہلا فرمان روا عبد المومن سریر آرائے
سلطنت تھا، عبد المومن خود ایک فاضل شخص تھا، محمد بن تومرت کے فیض صحبت سے جو
امام غزالی کا شاگرد تھا، اس کا فضل و کمال اور زیادہ ترقی کر گیا تھا، ابن رشد کی دیانت اور
کمالات علمی کا حال جب اسکو معلوم ہوا، تو دربار مین بلاکر اپنے خاص ندیمون میں شامل کیا
اور قضا کی خدمت بھی بحال رہنے دی ۵۴۷ھ ہجری میں جبکہ اسکی عمر ۲۷ برس کی تھی وہ قاضی
القضاۃ مقرر ہوا، یعنے اندلس سے لیکر مراکو تک کے کل علاقے اسکی قضا کے حدود مین
آگئے، وہ ان تمام مقامات کا دورہ کرتا تھا اور دیوانی عدالتوں کی نگرانی کرتا تھا وہ اپنی
تصنیفات مین اکثر بقید سال و تاریخ ان واقعات کا ذکر کرتا ہے، جو زمانہ تصنیف مین
پیش آئے۔ ان واقعات کی ترتیب دینے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کس کس سنہ میں وہ کہاں
کہاں تھا، عبد المومن نے ۵۵۶ھ ہجری میں قضا کی، اور اس کا بیٹا یوسف تخت نشین ہوا،

لہ ابن خلکان کی روایت کے موافق عبد المومن نے ۵۴۱ھ ہجری میں مراکش پر قبضہ کیا اور ۵۴۲ھ ہجری میں ملثمین کی
سلطنت کا خاتمہ ہوگیا، اس لیے عبد المومن کی سلطنت کا آغاز ۵۴۲ھ ہجری سے سمجھنا چاہیے،

لہ۲ ابن خلکان تذکرہ یوسف بن عبد المومن،

یوسف بہت بڑا فاضل اور بلند حوصلہ بادشاہ تھا، عبد المومن نے اسکی تربیت میں تیغ وقلم دونوں کا اہتمام کیا تھا، جو لوگ تیغ وقلم کے فن میں یکتائے زمانہ تھے، اسکی تعلیم وتربیت پر مامور کیے، اسی کا اثر تھا کہ یوسف دونوں میدانوں میں اپنے حریفوں سے آگے نظر آتا ہے، اس زمانہ میں عیسائیوں نے ٹالیڈو (طلیطلہ) کو دار السلطنت قرار دیکر اسپین کے اکثر اضلاع مسلمانوں کے ہاتھ سے چھین لیئے تھے یوسف نے اپنے زور بازو سے اکثر اضلاع واپس لیے لیکن اس مضمون میں ان واقعات کی تفصیل کا موقع نہیں یہاں صرف اس کے علمی حالات بیان کیے جا سکتے ہیں،

وہ اگرچہ اکثر علوم وفنون میں کمال رکھتا تھا لیکن فلسفہ اور عقلیات کی طرف خاص میلان تھا، اسی بنا پر اسنے ابن طفیل کو جو علوم عقلیہ میں ابن سینا کا ہم پایہ تھا ندیم خاص اور صیغہ علمی کا افسر مقرر کیا، ابن طفیل نے اس کے حکم کے مطابق دور دور سے ہر فن کے حکما اور فضلا دربار میں طلب کیے، ان میں ایک ہمارا نامور ابن رشد بھی تھا[1]،

ابن رشد جس کیفیت سے ساتھ دربار میں داخل ہوا ہے اس کی کیفیت اس نے خود بیان کی ہے وہ کہتا ہے کہ[2]

"جب میں دربار میں داخل ہوا تو ابن طفیل بھی حاضر تھا، اُس نے امیر المومنین یوسف کے حضور میں مجھکو پیش کیا اور میرے خاندانی اعزاز اور میری ذاتی لیاقت کو نہایت آب وتاب سے بیان کیا، یوسف میری طرف مخاطب ہوا، پہلے میرا نام ونسب پوچھا، پھر کہا کہ حکما عالم کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟ یعنے اُن کے نزدیک عالم قدیم ہے یا حادث؟ یہ سوال سنکر میں ڈر گیا! اور چاہا کہ بلطائف الحیل اس سوال کو ٹال جاؤں، چنانچہ میں نے کہا کہ میں فلسفہ سے واقف نہیں، یوسف مجھکو ہراساں دیکھکر ابن طفیل کی طرف متوجہ ہوا،

[1] ابن خلکان تذکرہ یوسف بن عبد المومن،

[2] پروفیسر رینان کی کتاب تذکرہ ابن رشد

اور اس مسئلہ پر بحث کرنی شروع کی، ارسطو اور افلاطون اور دیگر حکمانے جو کچھ اس مسئلہ سے متعلق لکھا ہے، بہ تفصیل بیان کیا، پھر متکلمین اسلام نے حکما کی رائے پر جو اعتراضات کیے ہین، ایک ایک کرکے بیان کیئے ہیں، یہ حالت دیکھکر میرا خوف جاتا رہا لیکن مجھکو سخت تعجب ہوا کہ ایک بادشاہ علوم عقلیہ میں یہ دستگاہ رکھتا ہے جو طبقۂ علما میں بھی شاذ و نادر کسی کو حاصل ہوتی ہی، تقریر سے فارغ ہوکر اُسنے پھر میری طرف توجہ کی اب مین نے آزادی کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کیے جب دربار سے رخصت ہوا تو مجھکو خلعت زر نقد اور سواری کا گھوڑا عنایت کیا،

فلسفہ کے سلسلہ میں ابن رشد کا جو بڑا کارنامہ ہی وہ تصنیفات ارسطو کی شرح ہے، اس کارنامہ کا اصلی باعث یوسف تھا، خود ابن رشد کا بیان ہے کہ ابن طفیل نے مجھکو بلا بھیجا، اور کہا کہ آج امیر المومنین (یوسف) اس بات افسوس کرتے تھے کہ ارسطو کا فلسفہ نہایت دقیق ہے اور مترجموں نے ترجمہ اچھا نہیں کیا، کاش کوئی قابل شخص اس کام پر آمادہ ہوتا اور فلسفہ ارسطو کو اس طرح آسان کرکے ادا کرتا کہ لوگ آسانی سے اسکو سمجھ سکتے یہ کہکر ابن طفیل نے ابن رشد سے کہا کہ میری تو اب عمر نہین رہی، اسکے علاوہ امیر المومنین کی خدمت سے فرصت نہیں ہوتی تم اس بار کو اُٹھالو اور تمھیں اس کام کو انجام بھی دے سکتے ہو، ابن رشد کا بیان ہے کہ اُسی دن سے مین نے اس کام کی ابتدا کی،

یوسف نے ۵۸۰ھ ہجری میں وفات پائی، اور اسکا بیٹا یعقوب منصور تخت نشین ہوا وہ نہایت اولو العزم بادشاہ تھا، موحدین کی سلطنت اس کے زمانے مین انتہائے کمال کو پہونچ گئی، اسکی وسعت فتوحات اور جاہ و جلال کی داستان گو نہایت دلچسپ ہے لیکن اسکا یہ محل نہیں، علمی مرحلے میں اُسنے جو کام کیئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ فقہا کو حکم دیا کہ کسی مجتہد یا امام کی تقلید نہ کرین، بلکہ خود اپنے اجتہاد سے کام لیں، عبد التول

میں فقہ کی پابندی اُٹھا دی، چنانچہ جو فیصلہ کیا جاتا تھا قرآن حدیث، اجماع، اور قیاس سے کیا جاتا تھا، **ابن خلکان** نے منصور کے حالات میں جہاں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے لکھتا ہے کہ ہمارے زمانے میں مغرب سے جو علماء آئے مثلاً ابو الخطاب ابن وحیہ ابو عمرو، محی الدین عربی وغیرہ سب کا یہی طریقہ تھا، یعنی کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے منصور نے جیسا کہ اسکی علم پروری سے لحاظ سے توقع کیجا سکتی ہے، ابن رشد کی نہایت قدردانی کی سنہ ۵۹۱ ہجری میں جب وہ الفانسو کے مقابلہ کے لیے جا رہا تھا، ابن رشد کو وداعی ملاقات کے لیے دربار میں طلب کیا اور اسقدر تعظیم و تکریم کی کہ تمام دربار کو حیرت ہوئی، ارکان سلطنت میں سب سے زیادہ تقرب عبد الواحد کو حاصل تھا جو منصور کا داماد اور ندیم خاص تھا دربار کی ترتیب میں اس کا تیسرا نمبر تھا، لیکن ابن رشد اس سے بھی آگے بڑھا یعنے منصور نے اسکو بُلا کر خاص اپنے پہلو میں جگہ دی اور دیر تک باتیں کرتا رہا ابن رشد جب دربار سے واپس آیا تو دوستوں نے بڑے جوش و خروش سے اسکو مبارکباد دی، لیکن انجام بین حکیم نے بجائے اسکے کہ مسرت کا اظہار کرتا، افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ یہ خوشی کا موقع نہیں بلکہ رنج کا ہے، کیونکہ دفعۃً اس درجہ کا تقرب بُرے نتائج پیدا کریگا اور افسوس ایسا ہی ہوا،

ابن رشد کی تباہی

سلاطین اسلام میں **منصور** اور اسکا ہمعصر سلطان **صلاح الدین** فاتح بیت المقدس اپنے زمانہ میں اسلام کے مایہ ناز تھے، اتفاق سے ان دونوں کو اہل کمال بھی ایسے ہاتھ آئے تھے جن پر آجتک اسلام کو ناز ہے، یعنے ابن رشد اور شیخ الاشراق لیکن زمانہ کی نیرنگیاں دیکھو! وہی صلاح الدین جس کا دامن انصاف ہر قسم کے داغ سے پاک ہے، شیخ الاشراق کا قاتل ہے!! اور وہی منصور جو عدل و انصاف کا پیکر مجسم تھا ابن رشد کا برباد کننده ہے،

ابن رشد کی تباہی اور بربادی، چونکہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے اسلیے مؤرخین نے

اسکے اسباب کی تحقیق میں بہت جدوجہد کی ہی، اور مختلف مورخوں نے مختلف اسباب بتائے ہین،- ایک روایت یہ ہی کہ ابن رشد کی عادت تھی کہ جب دربار میں منصور کسی علمی مسئلہ کے متعلق بحث کرتا تھا تو منصور کو "برادرمن" کہکر خطاب کرتا تھا، اس سے بڑھکر یہ کہ ارسطو کی کتاب الحیوانات کی جو شرح لکھی اسمیں زرافہ کے ذکر میں لکھا کہ میں نے اس جانور کو بادشاہ بربر (یعنے منصور) کے یہاں دیکھا ہے یہ معمولی طریقہ خطاب منصور کا صریحی توہین تھی،[۱]

یہ روایت اسلیے قرین قیاس معلوم ہوتی ہی کہ منصور بالطبع نہایت فخر پسند اور جاہ طلب تھا، یورپ نے بیت المقدس کو جب مسلمانوں کے ہاتھ سے چھیننا چاہا اور اس ارادہ سے یورپ کے ہر حصے سے فوجوں کا بادل اُٹھکر بیت المقدس کی طرف بڑھا، تو صلاح الدین نے منصور کے پاس قاصد بھیجا کہ یہ اسلام کی حمایت کا وقت ہے،

منصور ہر طرح اعانت دینے کے قابل تھا اور اعانت دینا چاہتا بھی تھا، لیکن اتنی بات پر برہم ہوگیا کہ صلاح الدین نے خط میں اسکو امیر المؤمنین کے لقب سے مخاطب نہین کیا تھا۔[۲]

صلاح الدین کا تو صرف یہ قصور تھا کہ اُس نے منصور کو تمام دنیا کا امیر المومنین نہین مانا، ابن رشد نے یہ غضب کیا کہ منصور کو صرف بربر کے بادشاہ کے لقب سے یاد کیا، اس سے بڑھکر منصور کی کیا اہانت ہوسکتی تھی،

اکثر مورخین کا بیان ہی کہ ابن رشد کی بربادی کا سبب منصور کا مذہبی تعصب تھا، اور بظاہر حالات بھی اس کے مقتضی ہین، کیونکہ ابن رشد پر جو فرد قرارداد جرم لگائی گئی تھی وہ الحاد اور بیدینی تھی،

حقیقت یہ ہی کہ موحدین کی سلطنت کی بنیاد مذہب کے سطح پر قایم ہوئی تھی اس سلسلہ کا

---

[۱] ابن ابی اصیبعہ، تذکرہ ابن رشد،

[۲] ابن خلکان تذکرہ یعقوب منصور،

بانی محمد بن تومرت امامت اور مہدویت کا مدعی تھا، اور اسی حیثیت سے اسنے سلطنت کی بنیاد قائم کی تھی، سلطنت کا صدر مقام مراکش تھا جو صحرا نشین بدوؤں کا گویا کعبہ تھا، اور جہاں ہر طرف بدویت اور سادہ عربیت کے آثار نظر آتے تھے، فوجی اور ملکی ارکان ٹھیٹ مذہبی خیال کے لوگ تھے، سلطنت کی ملکی قوت محض اسبات پر موقوف تھی کہ مذہبی جوش کا رنگ قائم رکھا جائے عیسائیوں نے اسپین کے اکثر حصے دبا لیے تھے ان کے مقابلہ میں صرف مذہبی جوش کی قوت سے عہدہ برائی ہو سکتی تھی، اور منصور نے جو اس سلسلہ کا تیسرا تاجدار تھا اسی قوت سے کام لیکر عیسائیوں پر عظیم الشان فتوحات حاصل کی تھیں، ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا کہ دربار فقہا اور محدثین کے ہاتھ میں تھا، اور تمام ملک پر انھیں کے خیالات چھا گئے تھے،

ان واقعات کے ہوتے ہوئے ابن رشد نے فلسفہ پر توجہ کی اور اسطرح کہ ارسطو کو اپنا امام اور پیشوا قرار دیا، اسکی تمام تصنیفات کی تہذیب و ترتیب کی، ان پر شرحیں لکھیں اور بہت سے مسائل کی جو جمہور اسلام کے خلاف تھے حمایت کی، ان میں ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ افلاک قدیم اور ازلی ہیں، خدا نے انکو نہیں پیدا کیا، بلکہ خدا صرف انکی حرکت کا خالق ہے، ابن رشد نے صرف یہی نہیں کیا کہ فلسفہ میں تصنیفات و تالیف کیں، اور فلسفیانہ مسائل کی اشاعت کی بلکہ اسکے ساتھ یہ بھی دعویٰ کیا کہ اسلامی عقائد کی صحیح تشریح وہی ہے جو ارسطو کے مسائل کے موافق ہو، اس سے بڑھکر یہ کہ اشاعرہ کے عقاید کو نہایت زور و شور کے ساتھ باطل کیا، اور ثابت کیا کہ یہ عقائد عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہیں،

اس موقع پر یہ لحاظ رکھنا چاہیئے کہ موحدین خود اشعری تھے اور انھوں نے اس مذہب کو شاہی مذہب قرار دیا تھا، ان سب پر یہ اضافہ ہوا کہ ابن رشد نے امام غزالی کی تہافۃ الفلاسفہ کا رد لکھا اور اس کتاب میں اکثر جگہ امام صاحب کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کیے حالانکہ امام غزالی موحدین کے پیران پیر تھے کیونکہ وہ محمد بن تومرت کے استاد تھے اور

محمد بن تومرت موحدین کا امام اور انکی سلطنت کا بانی تھا،

فلسفہ کا رنگ ابن رشد پر اس قدر غالب آگیا تھا کہ بعض اوقات بے اختیار انکی زبان سے ایسے الفاظ نکل جاتے تھے جو عام عقائد کے خلاف ہوتے تھے، انصاری نے ابو محمد عبد الکبیر سے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ منجموں نے پیشین گوئی کی کہ فلاں سال نہایت سخت ہوا کا طوفان آئیگا جس سے ہزاروں آدمی ہلاک ہو جائیں گے، عوام پر اس پیشین گوئی کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں نے تہ خانے تیار کرائے اور تمام ملک میں نہایت سخت پریشانی پھیل گئی یہاں تک کہ خود سلطنت کو اسکی طرف متوجہ ہونا پڑا دربار میں ایک بڑا مجمع ہوا اور تمام علما اور فضلا طلب کیے گئے، ان میں ابن رشد بھی تھا، دربار سے لوگ واپس آئے تو میں نے ابن رشد سے کہا کہ اگر یہ پیشین گوئی صحیح نکلی تو یہ دوسرا طوفان ہوگا، کیونکہ قوم عاد کے بعد اس قسم کا طوفان کبھی نہیں سنا گیا، ابن رشد بے اختیار جھلا کر بولا خدا کی قسم قوم عاد کا وجود ہی ثابت نہیں طوفان کا کیا ذکر ہے، اس پر تمام لوگ سخت حیرت زدہ ہو گئے،

ابن رشد کی یہ تمام باتیں اگر اسکی ذات تک محدود رہتیں تو چنداں شورش نہ ہوتی لیکن وہ قاضی القضاۃ تھا، فقیہ تھا، طبیب تھا، اور یہ سب تعلقات اس قسم کے تھے کہ اسکے معتقدات اور خیالات، تمام ملک میں پھیل جاتے تھے، ان واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ملک میں ایک آگ سی لگ گئی۔ ابن رشد سے جن لوگوں کو حسد تھا، اس سے بڑھکر کیا موقع مل سکتا تھا، ان لوگوں نے اس آگ کو اور بھڑکایا نوبت یہاں تک پہونچی کہ اگر منصور علانیہ ابن رشد سے باز پرس نہ کرتا تو رعایا اسکی طرف سے بدگمان ہو جاتی، غرض منصور نے حکم دیا کہ ابن رشد مع اپنے شاگردوں اور پیروؤں کے مجمع عام میں حاضر کیا جائے، چنانچہ قرطبہ کی جامع مسجد میں ایک عظیم الشان مجمع ہوا جس میں ابن رشد ایک مجرم کی حیثیت سے لایا گیا، اس مجمع میں تمام فقہا اور علما شریک تھے سب سے پہلے قاضی ابو عبد اللہ بن مروان نے تقریر کی اور کہا کہ ہر چیز میں نفع اور ضرر دونوں باتیں پائی جاتی ہیں، اس بنا پر نافع اور

مضر ہونے کا فیصلہ نفع یا ضرر کے اعتبار سے کیا جاتا ہے، قاضی ابو عبداللہ کے بعد ابو علی بن حجاج نے جو خطیب تھے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ ابن رشد ملحد اور بے دین ہو گیا ہے،

یہ سب ہوا لیکن اسلامی آزادی اور فراخ حوصلگی کا پھر بھی اتنا اثر تھا کہ یورپ کی مجلس انکوزیشن کی طرح یہ فتویٰ نہیں دیا گیا کہ مجرم زندہ جلا دیا جائے، بلکہ صرف اس پر قناعت کی گئی کہ وہ کسی علیحدہ مقام پر بھیج دیا جائے، حاسدوں نے یہ بھی شہادت دی تھی کہ ابن رشد کے خاندان کا کچھ پتہ نہیں چلتا، کیونکہ اسپین میں جو قبائل آباد ہیں ابن رشد کو کسی کا خاندانی تعلق نہیں رہا ہے، اس کا تعلق اگر ہے تو بنی اسرائیل کے خاندان سے ہے، اس بنا پر یہ قرار پایا کہ وہ موضع لوسینیا[۱] میں بھیج دیا جائے کیونکہ یہ خالص بنو اسرائیل کی بستی تھی اور ان کے سوا اور کوئی قوم یہاں سکونت نہیں رکھتی تھی،

چونکہ اصلی غرض عوام کو مطمئن کرنا تھا، اس لیے منصور نے ایک فرمان لکھوا کر تمام ملک میں شائع کرایا جس میں اس واقعہ کا اجمالاً اور ملاحدہ کی واہ و گیر کا تفصیلاً ذکر تھا۔

فرمان کی ابتدائی عبارت یہ ہے۔ قد کان فی سالف الدھر قوم خاضوا فی بحور الاوھام واقرلھم عوامھم بشفوف علیھم فی الافھام حیث لا داعی یدعوا الی الحی القیوم ولا حاکم یفصل بین المشکوک فیہ والمعلوم فخلدوا فی العالم صحائف مالھا من خلاق مسودۃ المعانی والاوراق بعدھا من الشریعۃ بعد المشرقین وتباینھا تباین الثقلین، یوھمون ان العقل میزانھا والحق برھانھا وھم یتشعبون فی القضیۃ الواحدۃ فرقا ویسیرون فیھا شواکل وطرقا، الخ

چونکہ فرمان کی عبارت فضول کم پر قوافی، اور حشو و زوائد سے بھری ہوئی ہے اس لیے ہم نے اس کا لفظی ترجمہ نہیں کیا، مضمون کا خلاصہ یہ ہے،

---

[۱] یہ قرطبہ کے قریب ایک چھوٹی سی بستی تھی جہاں صرف یہودی سکونت رکھتے تھے ۱۲

"زمانہ قدیم میں کچھ لوگ ایسے تھے جو وہم کے پیرو تھے، تاہم عوام ان کے کمال عقلی کے گرویدہ ہو گئے تھے، ان لوگوں نے اپنے خیال کے موافق کتابیں تصنیف کیں جو شریعت سے اسقدر دُور ہیں جسقدر مشرق مغرب سے دُور ہے، ہمارے زمانے میں بعض لوگوں نے انھیں ملاحدہ کی پیروی کی اور انھیں کے مذاق پر کتابیں لکھیں، یہ کتابیں بظاہر قرآن مجید کی آیتوں سے آراستہ ہیں لیکن تہ میں الحاد اور زندقہ ہے، جب ہم کو ان حالات کی خبر ہوئی تو ہم نے ان کو دربار سے نکال دیا اور حکم دیا کہ انکی تصنیفات جہاں ہاتھ آجائیں جلادی جائیں"

عوام میں جو برہمی پھیل گئی تھی اسکے روکنے کے لیے یہ تدبیر بھی کافی نہ تھی منصور نے ایک خاص محکمہ اس غرض سے قائم کیا کہ فلسفہ اور منطق کی تصنیفات ہر جگہ سے مہیا کی جائیں اور جلادیجائیں، چنانچہ سیکڑون ہزاروں کتابیں آگ کی نذر ہوئیں منصور نے یہ سب کچھ کیا لیکن وہ خود فلسفہ دان اور فلسفہ پرست تھا، اسلیے فلسفہ کی یہ تباہی اور بربادی اسکو دل سے گوارا نہ ہو سکتی تھی، تدبیر یہ اختیار کی کہ اس محکمہ کا افسر حفید ابو بکر بن زہر کو مقرر کیا جو خود بہت بڑا فلسفہ دان اور فلسفہ کا شیفتہ تھا، علامہ ابن ابی اصیبعہ نے ابو بکر بن زہر کے حال میں لکھا ہے کہ اس سے منصور کی غرض یہ تھی کہ ابو بکر بن زہر کے پاس فلسفہ اور منطق کی جو کتابیں آئینگی وہ برباد ہونے سے محفوظ رہ جائینگی، ابن زہر نے تمام کتب فروشوں کے پاس حکم بھیجدیا کہ فلسفہ کی جسقدر کتابیں موجود ہوں فوراً یہاں بھیجدی جائیں، اور جو لوگ فلسفہ کی تحصیل میں مصروف ہوں، انکو سزا دیجائے ابن زہر کا حکم منصور کا حکم تھا، اسلیے ضرور اسکی تعمیل ہوئی ہوگی، لیکن ابن زہر نے ان کتابوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا؟ اسکا فیصلہ تم خود کر سکتے ہو۔

قاصد رقیب بودہ و من غافل از فریب ‏ ‏ بیدرد، مدعای خود اندر میانہ ساخت

ملہ ابن ابی اصیبعہ ذکر حفید ابو بکر بن زہر ۱ ملہ ابن ابی اصیبعہ ذکر حفید ابو بکر بن زہر ۱

عام لوگ اس نکتہ کو نہ سمجھے لیکن **اشبیلیہ** میں ایک شخص رہتا تھا جو ابن زہر کا پرانا دشمن اور حاسد تھا، اُس نے اس مضمون کا ایک محضر طیار کیا کہ ابن زہر خود فلسفہ کا بڑا حامی ہے اور اسکے گھر میں اس فن کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں جو رات دن اُسکے مطالعہ میں رہتی ہیں، محضر پر بہت سے لوگوں کے دستخط کرائے اور منصور کے پاس بھیجا، منصور نے محضر کو پڑھ کر حکم دیا کہ عرضی دہندہ قید خانہ میں بھیجدیا جائے وہ گرفتار ہو کر قید ہوا اور تصدیق کرنے والے ڈر کے مارے روپوش ہو گئے، منصور نے لوگوں سے کہا اگر سارا اندلس جمع ہو کر شہادت دے تب بھی میں ابن زہر کی نسبت کسی قسم کی بدگمانی نہیں کر سکتا،

ابن رشد جب جلا وطن کیا گیا تو اسکے ساتھ اور بڑے بڑے فضلا بھی شہر بدر کیے گئے یعنے ابو جعفر ذہبی، ابو عبد اللہ محمد بن ابراہیم قاضی بجایہ، ابو الربیع الکفیف، ابو العباس،

ابن رشد کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ غریب جہاں جاتا تھا، ذلیل اور رسوا کیا جاتا تھا خود اس کا بیان ہے کہ سب سے زیادہ مجکو جو صدمہ پہونچا، یہ تھا کہ ایک دفعہ میں اور میرا بیٹا عبد اللہ، قرطبہ (کارڈوا) کی مسجد میں عصر کی نماز پڑھنے کے لیے گئے لیکن نہ پڑھ سکے چند بازاریوں نے ہنگامہ مچایا اور ہم دونوں کو مسجد سے نکال دیا،

تاج الدین کا بیان ہے کہ میں جب اندلس گیا تو ابن رشد سے ملنا چاہا، معلوم ہوا کہ معتوب سلطانی ہے اور کوئی شخص اس سے مل نہیں سکتا،

ابن رشد کی گرفتاری اور ذلت پر عوام میں نہایت مسرت کا اظہار کیا گیا، شعرا نے تہنیت آمیز نظمیں لکھیں بعض اشعار یہ ہیں،

لم تلزم الرشد یا ابن رشد | لما علا فی الزمان جدک
وکنت فی الدین ذا ریاء | ما کان ھکذا جدک[۱]

---

[۱] ابن ابی اصیبعہ ۱۲

دیگر

نفذ القضاء باخذ کل مموہ   متفلسف فی دینہ متزندق
بالمنطق اشتغلوا فقیل حقیقۃ   ان البلاء موکل بالمنطق

دیگر

تفلسفوا وادعوا علوما   صاحبها فی البعاد یشقی
واحتقروا الشرع وازدروہ   سفاہۃ منہم وحمقا

منصور نے جو کچھ کیا تھا صرف ایک حکمت عملی تھی جس سے ایک فوری ہنگامہ کا فرو کرنا مقصود تھا، شورش کم ہوئی تو منصور نے پھر ابن رشد کو دربار میں بلانا چاہا، اظہار حق یا منصور کی خاطر سے اشبیلیہ کے چند معزز لوگوں نے شہادت دی کہ ابن رشد پر جو تہمت لگائی گئی غلط اور افترا تھی، غرض سنہ ۵۹۵ ہجری میں ابن رشد کی قسمت کا چاند گہن سے نکلا، اور منصور نے اسکو مراکش میں طلب کیا لیکن ع

عید ہوئی ذوق مگر شام ہو

وفات — اب وقت آیا تھا کہ ابن رشد اپنے فضل و کمال کی داد پاتا، اور ارسطو کی طرح اس کے تاج فضیلت پر دولت کا طرہ بھی نظر آتا، لیکن بیرحم موت نے اسکا موقع نہ دیا، مراکش پہونچکر وہ بیمار ہوا اور جمعرات کی رات، صفر سنہ ۵۹۵ ہجری مطابق سنہ ۱۱۹۸ء میں مر گیا، شہر سے باہر جبانۃ ایک مقام ہے یہاں مدفون ہوا لیکن ایک مہینے کے بعد لوگوں نے قبر کھود کر ہڈیاں نکال لیں، اور قرطبہ لیجاکر مقبرۂ ابن عباس میں جو ابن رشد کا خاندانی قبرستان ہے، دفن کیں، وفات کے وقت اسکی عمر ۷۵ برس کی تھی، اس واقعہ سے ایک مہینے کے بعد منصور نے بھی انتقال کیا،

ابن رشد نے کئی اولادیں چھوڑیں، ایک بیٹا طب میں نامور ہوا باقی نے فقہ کی طرف توجہ کی اور عہدۂ قضا پر ممتاز ہوئے،

اخلاق وعادات

ابن رشد کے اخلاق وعادات بالکل حکیمانہ تھے، وہ نہایت متواضع اور منکسر المزاج تھا، ایک مدت تک عہدۂ قضا پر مامور اور دربار سلطنت میں مقرب رہا لیکن اپنی دولت وجاہ سے بذات خود مطلق فائدہ نہیں اُٹھایا، اسکو جو کچھ ملتا تھا وطن اور اہل وطن پر صرف کرتا تھا، دربار شاہی کے تقرب سے بھی اُس نے جو کام لیا وہ خلائق کی کاربرآری اور عام نفع رسانی تھی[1] حلم اور عفو کی یہ حالت تھی کہ ایک شخص نے اسکو مجمع عام میں برا بھلا کہا اور سخت توہین کی، وہ بجائے اسکے کہ مخالف سے انتقام لیتا، اُلٹا مشکور ہوا کہ اسکی بدولت مجھکو اپنے حلم کے جانچنے اور آزمانے کا موقع ملا، چنانچہ اسکے صلہ میں کچھ روپے نذر کیے لیکن ساتھ ہی اسکو یہ نصیحت بھی کی کہ اوروں سے یہ سلوک کرنا، ورنہ ہر شخص اس قسم کے احسان کا قدردان نہیں ہوتا،

مزاج میں انتہا درجہ کا رحم تھا، مدتوں قاضی رہا لیکن کبھی کسی کو قتل کی سزا نہیں دی اور ایسا ہی موقع آپڑتا تو عدالت کی مسند سے علیحدہ ہوجاتا اور کسی کو اپنا قائم مقام کردیتا،

مطالعہ اور کتب بینی کا بے انتہا شوق تھا، ابن الابار کا بیان ہے کہ تمام عمر میں صرف دو راتیں ایسی گذریں کہ وہ کتب بینی اور مطالعہ سے باز رہا، ایک نکاح کی رات، اور دوسری وہ رات جسمیں اسکے باپ نے وفات پائی،

انتہا درجہ کا فیاض اور سخی تھا، اسکی فیاضی دوست دشمن پر یکسان تھی، کہا کرتا تھا کہ اگر میں صرف دوستون کو دون تو میں نے وہ کام کیا جسکو خود میرا دل چاہتا تھا، احسان اور فضیلت یہ ہے کہ مخالفون اور دشمنون کے ساتھ سلوک کیا جائے،

وطن کا نہایت شیفتہ تھا، افلاطون نے جمہوریت پر جو کتاب لکھی ہے اُسمیں یونان کی نہایت تعریف کی ہے، اور لکھا ہے کہ یہان کے لوگون کو تمام دنیا کی بہ نسبت علوم عقلیہ سے خاص مناسبت ہے، ابن رشد نے اس کتاب کی شرح میں اپنے وطن اسپین کو بھی یونان کا ہم پایہ قرار دیا، جالینوس کا قول تھا کہ دنیا میں سب سے عمدہ آب و ہوا یونان کی ہے، ابن رشد نے کتاب الکلیات میں برخلاف

[1] ابن الاباد ۱۲

اسکے دعوی کیا کہ اس فخر کا مستحق یونان نہین بلکہ قرطبہ (کارڈوا) ہی، ایک دفعہ منصوؔر کے دربار مین ابن زہر اور ابن رشد میں یہ بحث ہوئی کہ اشبیلیا و قرطبہ مین کسکو ترجیح ہی - ابن زہر اپنے وطن اشبیلیہ کو ترجیح دیتا تھا، ابن رشد نے کہا اشبیلیہ میں جب کوئی عالم مرجاتا ہی اور اُس کے کتب خانے کے فروخت کرنیکی ضرورت پیش آتی ہی تو کتب خانہ کو قرطبہ میں لانا پڑتا ہی کیونکہ اشبیلیہ میں ان چیزونکو کوئی پوچھتا نہین، لیکن قرطبہ مین جب کوئی مغنی اور کلانوت مرتا ہی تو اسکے آلاتِ موسیقی اشبیلیہ میں جاکر فروخت ہوتے ہیں، ان واقعات سے دونون شہرون کی فضیلت کا اندازہ ہوسکتا ہی،

تصنیفات ابن رشد مختلف علوم وفنون میں کمال رکھتا تھا، اور تمام علوم وفنون میں اس کے تصنیفات موجود ہیں، ابن الابار کی روایت کے موافق اسکی کل تصنیفات سے صفحے بیس ہزار ہین۔ جن علوم کو اسنے خاص طرح پر ترقی دی وہ فقہ، طب، اور فلسفہ ہیں، انمیں سے فقہ اور طب کی تصنیفات کی تفصیل ہم اس موقع پر کرتے ہین، فلسفہ کی تصنیفات پر آیندہ لکھنے کا موقع ملے گا، وہ بہت بڑا فقیہ تھا اور مدتون قضا کے منصب پر ممتاز رہ چکا تھا، اس تعلق سے اس نے فقہ مین حسب ذیل کتابیں لکھیں جو سب کے سب مقبول و متداول اور فقہ مالکی کے ضروری ارکان ہین،

ہدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد، اس کتاب میں اُسنے ہر مسئلہ کے دلائل اور وجوہ لکھے ہین، ابو جعفر ذہبی کا قول ہے کہ فقہ مین اُس سے بہتر کتاب مین نے نہین دیکھی، نفح الطیب مین ابن سعید کا قول نقل کیا ہی کہ کتاب جلیل و معظم و معتمد عند المالکیۃ،

تحصیل، اسمیں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے فقہی اختلافات اور اسکے دلائل لکھے ہین اور خود محاکمہ اور فیصلہ کیا ہے،

مقدمات ہم نے یہ کتاب سید محمود مرحوم کے لیے کتب خانہ خدیو سے نقل کراکر منگوائی تھی، خیال تھا کہ ایک فلسفی، فقہ کے فن کو لکھے گا تو کیونکر لکھے گا، لیکن کتاب کو پڑھ کر ہم کو کچھ استعجاب نہیں ہوا، بے شبہہ فقہ کی اور کتابوں کی نسبت وہ زیادہ صاف مرتب اور قریب الفہم ہے

لیکن فلسفیانہ تدقیقات کا پتہ نہین، ابوزید دبوسی کی کتاب الاسرار ہم نے دیکھی ہر دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے،

اصول فقہ میں اسکی دو کتابیں ہین،

منہاج الادلۃ، مستقل تصنیف ہے،

خلاصۃ المستصفی، امام غزالی نے اخیر عمر میں مستصفی ایک کتاب لکھی تھی یہ اسکا خلاصہ ہے

طب، مین ابن رشد کی تصنیفات نہایت کثرت سے ہین اور اس فن میں اس نے بہت کچھ اضافہ کیا ہے، یہ تصنیفات دو قسم کی ہین،

ایک جو اُسنے بطور خود لکھی ہین، ان میں کتاب الکلیات نہایت جامع اور محققانہ ہی اسکے سوا اور چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں، مثلاً مقالۃ فی المزاج، مقالۃ فی نوائب الحمی،

دوسری قسم کی وہ کتابین ہیں جو یونانی تصنیفات کا خلاصہ یا شرحین ہیں، انکی تفصیل حسب ذیل ہی، شرح کتاب الاسطقسات لجالینوس، تلخیص کتاب المزاج لجالینوس، تلخیص کتاب القوی لجالینوس، تلخیص کتاب العلل والاعراض لجالینوس، تلخیص کتاب التعرف لجالینوس، تلخیص کتاب الحمیات لجالینوس، تلخیص کتاب الادویۃ المفردۃ لجالینوس، تلخیص النصف الثانی من کتاب حیلۃ البرء لجالینوس،

ابن رشد کی تصنیفات کی کثرت، تنوع، جدت مضامین تحقیق و تنقید، جسقدر حیرت خیز ہی اس سے زیادہ یہ امر تعجب انگیز ہے، کہ تمام تصنیفات نہایت کثیر الاشغالی اور پریشانی کی حالت کی ہین، وہ قاضی القضاۃ اور افسر صیغۂ عدالت تھا، اس تعلق سے وہ مراکو اور اسپین کے تمام بڑے بڑے اضلاع کا دورہ کرتا رہتا تھا، انھیں دوروں میں تصنیف و تالیف کا شغل بھی رہتا تھا کتاب الحیوان کی شرح میں خود اسنے لکھا ہی کہ یہ کتاب ماہ صفر سنہ ۵۶۵ ہجری میں بمقام اشبیلیہ تمام کی پھر عذرخواہی کی ہی کہ اگر اس کتاب میں سہو و خطا ہو گئی ہو تو معافی کی امید ہے کیونکہ اولاً تو کار منصبی سے فرصت نہیں ملتی، دوسرے کتب خانہ وطن میں ہی اور ضروری کتابین تک ساتھ نہین اسی قسم کی عذرخواہی کتاب الطبیعی کی شرح مین بھی کی ہی، اور لکھا ہی کہ یہ کتاب رجب سنہ ۵۶۵ ہجری

میں بمقام اشبیلیہ تمام ہوئی، مجسطی کا جو اختصار کیا ہے اسمیں لکھا ہے کہ میں نے صرف اہم اور مقدم مطالب لے لیے ہیں، میری حالت بالکل اُس شخص کی سی ہی جسکے مکان میں آگ لگ گئی ہو اور وہ گھبراہٹ اور اضطراب میں صرف مکان کی ضروری اور قیمتی اسباب نکال نکال کر پھینک رہا ہو، کتاب الالٰہیات اور کتاب البیان سنہ ۵ ہجری کی آغاز میں ساتھ ساتھ لکھنی شروع کی تھی، اسی اثنا میں بیمار ہوگیا، اور زیست کی امید نہیں رہی، اس خیال سے کتاب البیان کو چھوڑ کر الٰہیات کی تکمیل میں مصروف ہوگیا کہ کتاب البیان کے ساتھ کہیں یہ بھی رہ نہ جائے، جوہر الکون پر جو رسالہ لکھا ہے وہ مراکو میں سنہ ۵۷۴ ہجری میں تمام ہوا، لیکن سنہ ۵۷۵ ہجری میں پھر اشبیلیہ واپس جانا پڑا یہاں اس نے فقہ پر ایک کتاب لکھی، اسی سنہ میں ابن طفیل کی وفات کی وجہ سے منصور نے اسکو مراکو میں بلالیا اور اپنا طبیب خاص مقرر کیا،

یہ ایاب و ذہاب، کثرت اشغال، پریشانی، اور پراگندہ دلی، کوئی چیز اس کو اپنے اشغال سے نہ روک سکی، اور یہ ابن رشد کی خصوصیت نہیں، بزرگان اسلام میں عموماً یہ ادا پائی جاتی ہے، کہ انقلابات زمانہ کی باد صرصر اُن کے اوراق حواس کو پریشان نہیں کرسکتی تھی، امام رازی، بوعلی سینا امام غزالی، شہاب مقتول وغیرہ کے جو کارنامے ہیں، وہ بھی اسی قسم کی بے سروسامانی اور پریشانی کے زمانہ کی یادگار ہیں، ✦

یوروپ میں ابن رشد کی تصنیفات کی جسطرح اشاعت ہوئی اور اسکا اثر جو یوروپ پر پڑا وہ ایک دلچسپ داستان ہی لیکن اسکے بیان کرنے سے پہلے مناسب ہی کہ یوروپ میں عام فلسفۂ عرب کے اشاعت کی ابتدا کی مختصر کیفیت بیان کیجائے،

یوروپ جس زمانہ میں مسلمانوں سے صلیبی لڑائیاں لڑ رہا تھا، اسوقت مسلمانوں کی نسبت یوروپ کے عجیب عجیب خیالات تھے، لیکن جب اسلامی ممالک میں اہل یوروپ کا گذر ہوا اور انکو ہر طرف مسلمانوں کے علمی اور عملی ترقیوں کے عجیب و غریب منظر نظر آئے تو سب سے پہلا اثر جو یوروپ کے دل پر پڑا وہ مسلمانوں کی علمی فضیلت کا اعتراف تھا،

یورپ کی یہ فیاض دلی رشک کے قابل ہی کہ ایکطرف تو مذہبی اختلافات کی بنا پر مسلمانون کے خون کا پیاسا تہا، لیکن دوسری طرف اُسنے بے تکلف مسلمانون کے خوان کرم سے زلہ ربائی شروع کردی۔

سب سے پہلے طلیطلہ (ٹالیڈو) کی لارڈ بشپ نے جسکا نام ڈرمیونڈ تھا سنہ ۱۱۳۰ء مین ایک محکمہ اس غرض سے قائم کیا کہ اسلامی فلسفیانہ تصنیفات عربی سے لاطینی زبان مین ترجمہ کی جائین، اس محکمہ کے ارکان وہ یہودی علماء تھے جو عربی زبان اور عربی فلسفہ سے ماہر تھے ان میں سب سے ممتاز یوحنا تھا جو اشبیلیہ کا رہنے والا تھا، اس محکمہ کا افسر گوندلسالفی مقرر ہوا، اس محکمہ نے ابن سینا کی بہت سی کتابین ترجمہ کیں، چندروز کے بعد دی کریمون اور الفرڈ دی مولائی نے فارابی اور کندی کی بعض بعض تصنیفیں بھی ترجمہ کین،

اسی زمانہ میں جزیرہ سسلی اور نیپولی مین بھی عربی کتابوں کا ترجمہ شروع ہوا، یہ ابتدائی حالت تھی لیکن فلسفہ عرب کی اشاعت کا اصلی زمانہ درحقیقت فریڈرک دوم سے شروع ہوتا ہی جو جرمن کا مشہور فرمانروا گذرا ہی، یہ علم پرور بادشاہ درحقیقت یورپ کا **مامون الرشید** تھا اسکی طبیعت فطرۃً فلسفیانہ واقع ہوئی تھی اور جسقدر مذہبی گروہ اسکے خیالات کی مخالفت کرتا تھا، اسکا میلان فلسفہ کی جانب اور بڑھتا جاتا تھا۔ چونکہ اُس زمانے مین عموماً علم وفن کے سرچشمہ اہل عرب تسلیم کیے جاتے تھے اُس نے ایک سسلی کے باشندہ سے عربی زبان سیکھی اور عرب کے رسم ورواج کا اسقدر شیفتہ ہوا کہ مشرقی بادشاہوں کی طرح اُسنے حرم اور خواجہ سرا مقرر کیے، دور دور سے عربی دان فضلاء جمع کیے، یہانتک کہ بغداد کے علماء وفضلا بھی اسکے دربار میں پہنچے جو بڑی بڑی آستینوں والی جبائین زیب بدن کرتے تھے،

فریڈرک علانیہ عرب کے علوم و فنون ومراسم کی مداحی کرتا تھا حالانکہ یہ امر اسکے

تمام دربار کو سخت ناگوار تھا، باایں ہمہ صلیبی لڑائیون کے سلسلے میں یورپ نے جب بیت المقدس پر چھٹا حملہ کیا تو یہ بادشاہ بھی ایک فوج کثیر کے ساتھ اس حملہ میں شریک ہوا، لیکن یہاں بھی وہ علمی مشاغل سے خالی نرہا مسلمان علما کو اپنی مجلس میں بلاتا تھا اور ریاضی کے مشکل مسائل ان سے حل کراتا تھا، ان مسائل کو وہ اسلامی فوج کے سپہ سالار کے پاس بھی حل کیغرض سے بھیجا کرتا تھا، اگرچہ مسلمانون کے ساتھ وہ سخت لڑائیاں لڑتا تھا لیکن مذہب کی یہ حالت تھی کہ ہیکل مقدس میں جاکر حضرت عیسیٰ کے مقدس زیارت گاہ کی ہنسی اُڑاتا تھا، یہانتک کہ ایک دن لارڈ بشپ کے سامنے بھی اُسنے اسی قسم کی تمسخر آمیز باتیں کیں جنکو بشپ نے قلمبند کرلیا،

عیسائی عموماً اسکو بُرا سمجھتے تھے اور خصوصاً پادریون نے تو اس کی ہجو میں نظمیں لکھیں،

پوپ نہم گریگورلیس نے اپنی ایک تحریر مین اسکی نسبت فتویٰ دیا کہ یہ بادشاہ فساد کا بادشاہ ہی، کیونکہ وہ اسبات کا قائل ہو کہ جب تک کوئی چیز عقل اور نظام طبعی سے نہ ثابت ہو اُسکو تسلیم نہین کرنا چاہیئے،

عام عیسائی جماعت نے اسکو دجال کا خطاب دے رکھا تھا لیکن اُس نے ان تمام باتون کی مطلق پروانکی اور نہایت آزادخیالی سے عربی کتابین ترجمہ کرائیں،

یہ وہ زمانہ تھا کہ ابن رشد کے یہودی تلامذہ، اسپین سے نکل کر مختلف ممالک میں پھیل گئے تھے، ان میں سے ایک خاندان جو طیبون کہلاتا تھا، اسپین سے ہجرت کرکے فرانس میں چلا آیا تھا ان میں سے موسیٰ بن طیبون اور سموئیل بن طیبون نے ابن رشد کی بعض کتابیں عبرانی میں ترجمہ کیں ابن رشد کی تصنیفات کا یہ پہلا ترجمہ تھا، شہنشاہ فریڈرک نے جب اسلامی کتابوں کا ترجمہ کرانا چاہا تو ان یہودی علما کو اُس نے دربار میں بلایا اور یہ خدمت انکے سپرد کی، یہودا ابن سلیمان جو ٹالیڈو کا رہنے والا تھا اور فریڈریک

کے خاص مقربین میں تھا اُسنے سنہ ۱۲۴۷ء مین ایک کتاب لکھی جسکا نام طلب الحکمۃ رکھا یہ کتاب تمامتر ابن رشد کی تصنیفات سے ماخوذ تھی، ایک اور یہودی عالم جسکا نام یعقوب بن ابی مریم تھا اور جونیپولی میں مقیم تھا اور خاندان طیبون کا داماد تھا اسنے سنہ ۱۲۳۲ء میں شہنشاہ فریڈرک کی فرمایش کسے ابن رشد کی متعدد تصنیفات ترجمہ کیں، اسکے بعد کالونیم نے جو ارل کا باشندہ تھا اور سنہ ۱۲۸۷ء میں اسکی ولادت ہوئی تھی ابن رشد کی کتابوں کا عبرانی زبان میں ترجمہ شروع کیا، وہ لاطینی زبان بھی جانتا تھا چنانچہ تہافۃ التہافۃ کا ترجمہ اسنے لاطینی ہی زبان میں کیا جو سنہ ۱۳۲۸ء میں انجام کو پہونچا،

غرض چودہوین صدی سے آغاز تک ابن رشد کا فلسفہ تمام یہود میں پھیل گیا،

اسی زمانہ میں ایک یہودی فاضل نے جسکا نام لاوی بن حرشون تھا اور جسکو اہل یورپ لاون افریقی کے نام سے خطاب کرتے تھے، ابن رشد کے فلسفہ کی اسیطرح شرح اور خلاصے لکھے جسطرح ابن رشد نے ارسطو کے فلسفہ کی شرح اور تلخیص کی تھی، یہ فاضل بالکل آزاد خیال تھا، وہ مادہ کے قدیم ہونے کا قائل تھا نبوت کی نسبت اسکا یہ اعتقاد تھا کہ وہ انسانی قوتوں سے ایک قوت کا نام ہے، اسنے یہودی مذہب کو فلسفہ سے ملانا چاہا اور فلسفہ اور مذہب میں تطبیق کی۔ ان یہودی حکماء میں سب سے آخر شخص الیاس مریجو تھا جو پیڈوا کی یونیورسٹی کا پروفیسر تھا،

سولھوین صدی عیسوی میں یہود کے مذہبی علماء نے یہ دیکھکر کہ فلسفہ مذہب کو برباد کئے دیتا ہے بڑے زور شور سے فلسفہ کی مخالفت شروع کی، چنانچہ مشغینو نے جو مذہبی شیشنگی کا لقب رکھتا تھا امام غزالی کی کتاب تہافۃ الفلاسفہ سنہ ۱۵۳۸ء میں شایع کی جس سے ابن رشد کی مخالفت کا اظہار مقصود تھا،

اسوقت تک ابن رشد کے فلسفہ کی جو کچھ اشاعت اور ترویج ہوئی تھی زیادہ تر یہودیوں میں ہوئی تھی اور وہی فلسفہ ابن رشد کے حامی اور پیرو خیال کئے جاتے تھے

اب وہ زمانہ آیا کہ تمام یورپ میں ابن رشد کے فلسفہ نے رواج پایا،
سب سے پہلا شخص جسنے یہ خدمت سنہ ۱۲۳۰ء میں انجام دی میکال اسکاٹ تھا، یہ فاضل ٹالیڈو (طلیطلہ) میں قیام رکھتا تھا، اور شاہ فریڈرک جسکا ذکر اوپر گذر چکا ہے اسکے درباریوں مین تھا،

اسکاٹ کے بعد ہارمن نے جو خاص جرمن کا رہنے والا تھا ابن رشد کے فلسفہ کی اشاعت کی، یہ فاضل بھی فریڈرک کے دربار مین ایک معزز حیثیت رکھتا تھا، اسکے بعد اسطرف عام توجہ شروع ہوئی، یہانتک کہ تیرہوین صدی کے ختم ہونے سے پہلے ابن رشد کی تمام فلسفیانہ تصنیفات لاطینی زبان میں ترجمہ ہو چکی تھیں،

ابن رشد کے فلسفہ کی مخالفت ابن رشد کے خیالات کا یورپ میں پھیلنا تھا کہ تمام عیسائیوں کی مذہبی جماعت مین ایک آگ سی لگ گئی ہے، سنہ ۱۲۰۹ء میں ایک بڑا مذہبی جلسہ منعقد ہوا جس نے پیروان ابن رشد کی گمراہی کا فتویٰ دیا،

سنہ ۱۲۱۵ء میں عیسائی مذہبی محکمہ نے یہ فتویٰ نافذ کیا کہ فلسفہ ارسطو اور تصنیفات بو علی سینا کا پڑھنا پڑھانا حرام ہے سنہ ۱۲۳۱ء مین پوپ نہم نے جسکا نام گریگیوریوس تھا حکم دیا کہ عرب کے فلسفہ کا پڑھنا پڑھانا قطعاً بند کر دیا جائے،

گولیم ڈفرن جو ایک مشہور فاضل تہا اسنے نہایت سختی سے ابن سینا کے فلسفہ کا رد لکھا، ڈفرن کے بعد پیر نے جو بہت بڑا متکلم تسلیم کیا جاتا تھا فلسفہ عرب کے رد میں بہت سی کتابیں لکھین، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ بو علی سینا کا مداح تھا، اور ابن رشد کو اس وجہ سے برا سمجھتا تھا کہ اُسنے ابن سینا کی مخالفت کی،

مخالفین ابن رشد میں سب سے زیادہ شہرت، سینٹ ٹامس نے حاصل کی یہ شخص مغربی کلیسا کا سب سے بڑا متکلم اور عالم خیال کیا جاتا تھا، اس نے ابن رشد کے فلسفہ کو نہ صرف مذہبی بلکہ عقلی دلائل سے بھی رد کیا، اور چونکہ ابن رشد فلسفۂ ارسطو کا

سب سے بڑا شارح خیال کیا جاتا تھا، ابن رشد کے مقابلہ میں وہ دلائل استعمال کیے جو ارسطو کے دلائل سے ماخوذ تھے،

پادریوں نے اس خدمت کے صلہ مین اسکی اسقدر عزت کی کہ اسکو ایک مقدس مذہبی امام قرار دیا، چودھوین صدی سے ایک مشہور مصور نے سنہ ۱۳۴۰ء مین ایک عمدہ مرقع بنایا جو مقدس کاترین کے گرجا مین بمقام بیزہ (اٹلی) نصب کیا گیا، اس مرقع کی یہ صورت تھی کہ سب سے اوپر ذات مقدس جلوہ گر ہے جسکے چارونطرف ملائکہ صف بستہ ہین، ذات مقدس سے نور کی شعاعین منتشر ہوتی ہیں، نیچے بادل کے سطح پر حضرت موسیٰ پولوس اور اناجیل اربعہ ہین، اور نور کی شعاعین انپر آکر پڑتی ہین، بادل کے نیچے مقدس ٹامس کھڑا ہی جسپر نور کی شعاعین حضرت موسیٰ وغیرہ سے گذر کر پڑتی ہین، ان شعاعون کے علاوہ نور کی تین شعاعین براہ راست ذات مقدس سے ٹامس پر پڑتی ہین، ذرا نیچے دونون جانب ارسطو اور افلاطن کھڑے ہین، ان دونون کے ہاتھ میں دو کتابیں ہین جن سے نور کا ایک سلسلہ بلند ہوکر ٹامس کے سر تک پہونچتا ہے اور ذات الٰہی کے نور میں مخلوط ہو جاتا ہے، ٹامس کرسی پر جانشین ہی اُسکے ہاتھ میں کتاب مقدس ہی جو کھلی ہوئی ہے، اور جسکے سر صفحہ پر یہ عبارت ہی "میرا منھ سچ بولتا ہی اور میرے ہونٹھ گمراہی سے منکر ہین،" ٹامس کی کرسی کے چارونطرف، ہر درجے کے مقدس پادریوں کی قطار ہے جن پر ٹامس کی تصنیفات کی شعاعین پڑرہی ہین، انھین شعاعونمین سے ایک شعاع ابن رشد پر پڑرہی ہی جو ٹامس کے سامنے زمین پر پچھڑا ہوا پڑا ہے،

ابن رشد کے جن مسائل کا رد لکھا وُہ حسب ذیل ہین،

۱۔ مادہ ازلی ہے اور اسکی حقیقت نہیں معلوم ہوسکتی،

۲۔ سلسلہ کائنات کا اتصال علت اولی سے جسطرح ابن رشد نے بیان کیا تھا،

۳ ـ علت اولی اور معلولات مین عقل کا توسط،

۴ ـ کوئی شی عدم محض سے وجود میں نہیں آسکتی،

ٹامس نے ان مسائل کو باطل ثابت کیا اور یہ دعوی کیا کہ اصل میں ارسطو نے غلطی کی تھی اور حکمائے اسلام نے غلطی پر غلطی کی،

ٹامس کی وفات کے بعد ریمون مارتینی نے فلسفۂ عرب سے مخالفت میں کتابیں لکھیں، لیکن ان تصنیفات میں اُسنے زیادہ تر امام غزالی سے مدد لی، وہ کہا کرتا تھا کہ فلسفہ کا رد فلسفی (غزالی) کی زبان سے زیادہ موزون ہی،

ریمون کے بعد بہت سے مصنفین نے ٹامس کی حمایت اور فلسفۂ عرب کی مخالفت میں کتابین لکھین، ان میں یہ مذاق اسقدر بڑھا کہ اٹلی کے مشہور شاعر ڈینٹی نے بھی ابن رشد کی ہجو لکھی اسکے بعد جیل دی روم نے بڑے زور شور سے فلسفۂ عرب خصوصاً ابن رشد کے فلسفہ پر حملہ کیا اور اسمین اسقدر ناموری حاصل کی کہ مقدس ٹامس کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہوئی تھی،

لیکن اس میدان میں جو شخص سب کا پیشرو تھا وہ ریمون لول تھا یہ شخص ۶ برس یعنی سنہ ۱۳۱۰ء سے سنہ ۱۳۱۶ء تک پیرس سے لیکر جنیوہ نیپولی بزہ وغیرہ کا صرف اس غرض سے دورہ کرتا رہا کہ لوگونکو فلسفۂ عرب کی مخالفت پر آمادہ کرے، یہانتک کہ جب سنہ ۱۳۱۱ء مین ویانا میں ایک مجلس منعقد ہوئی تو اُسنے پوپ کی خدمت میں ایک درخواست پیش کی جسمیں تین باتونکی درخواست کی، ایک یہ کہ ایک بڑا لشکر مسلمانون سے برباد کرنیکے لیئے طیار کیا جائے، دوسرے یہ کہ عربی زبان کی تعلیم کیلیے یونیورسٹیان قایم کیجائین، تیسرے یہ کہ ابن رشد کی تصنیفات کے ناجائز ہونیکا فتوی دیدیا جائے،

حامیان ابن رشد مذہبی جماعت مین اگرچہ فلسفۂ عرب کی نسبت اسقدر شورش برپا تھی لیکن فلسفہ کا جادو ایسا نہ تھا کہ کوئی جماعت اس سے بے اثر رہ سکتی، مذہبی ہی گروہ

مین ایک ایسا فرقہ پیدا ہو گیا ہے جسنے نہایت استقلال اور دلیری سے فلسفہ عرب کی حمایت کی یہ فرقہ فرانسیسکن کہلاتا تھا، ان لوگون نے بڑی آزاد خیالی اور دلیری سے روما کی سطوت حکومت کا مقابلہ کیا، اور ٹامس کے رد مین کتابین لکھیں چونکہ یہ لوگ ٹامس کے عقائد کے ابطال کو اپنا اصلی فرض سمجھتے تھے اسلیئے انکو خواہ مخواہ فلسفہ عرب سے اعانت لینی پڑی،

اس فرقہ کے مشہور لیڈر جان دی لارڈ شل نے علانیہ ابن سینا کی پیروی کا اظہار کیا، اور علم النفس و اخلاق کی نسبت اسنے جو کچھ لکھا تمامتر ابن سینا کی تصنیفات سے لکھا، اب فرانس کی مذہبی تعلیمگاہ دو فرقوں میں تقسیم ہو گئی سوربون کے مدرسہ میں ٹامس کے معتقدات کی تعلیم دیجاتی تھی لیکن پیرس کی یونیورسٹی میں ابن رشد کا فلسفہ پڑھایا جاتا تھا ڈامنیکین فرقہ سوربون کی تعلیم کا حامی تھا چنانچہ ان دونون نے متفق ہو کر پوپ چہارم سے جسکا نام الگزنڈر تھا چھ سات برس کے عرصہ مین چالیس فرمان اس مضمون کے صادر کرائے کہ عرب کے فلسفہ کا پڑھنا پڑھانا حرام ہے سنہ ۱۲۶۹ء میں پیرس کی مذہبی مقدس مجلس نے یہ فرمان صادر کیا،

یہ جلسہ ان لوگون کے فاسد العقیدہ ہونیکا فتویٰ دیتا ہے جو اعتقادات ذیل کے قائل ہیں،

۱۔ عالم ازلی ہے،

۲۔ تمام انسانون میں ایک ہی عقل پائی جاتی ہے،

۳۔ انسان کا سلسلہ کسی ایک آدم معین تک منتہی نہیں ہوتا،

۴۔ نفس جسم کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے،

۵۔ خدا جزئیات کا عالم نہیں ہے،

۶۔ خدا قابل فنا چیزونکو ابدی نہیں کر سکتا،

ان سب ہنگامون کے ساتھ ابن رشد کا فلسفہ یورپ میں برابر پھیلتا گیا،

یہانتک چودہویں صدی میں بڑا حصہ یورپ کا ابن رشد کا پیرو بن گیا، چنانچہ فرانس کے مشہور بادشاہ لوئیس یازدہم نے ۱۴۷۳ء میں جب صیغہ تعلیم کی اصلاح کرنی چاہی تو پروفیسروں کو حکم دیا کہ ارسطو کی تصنیفات پر ابن رشد کی جو شرحیں ہیں وہ نصاب میں داخل کیجائیں۔ اب یہ نوبت پہونچی کہ تمام یورپ میں ابن رشد کا فلسفہ علانیہ پڑھا جاتا تھا اور کوئی مخالفت نہیں کرسکتا تھا،

پیڈوا کی یونیورسٹی ابن رشد کے فلسفہ نے اگرچہ تمام یورپ میں رواج پایا لیکن اعلیٰ صدر مقام اس فلسفہ کا پیڈوا کی یونیورسٹی تھی جو اٹلی میں واقع تھی، اس یونیورسٹی میں سب سے پہلے جسنے ابن رشد کے فلسفہ کو داخل نصاب کیا پطر ہس دابانو تھا، اب یورپ کے تمام علمی طبقہ میں ابن رشد کی یہ عزت کیجاتی تھی کہ لوگ اُسکے نام پر فخر کرتے تھے

الملل والنحل

اور

ابن حزم ظاہری

اسلام میں ایک مدت تک معقول و منقول الگ الگ رہے امام غزالی نے دونوں کا تعارف کرایا، اور رفتہ رفتہ اتحاد اسقدر بڑھا کہ آج دونوں کو الگ کرنا چاہیں تو نہیں کرسکتے محدثین کا گروہ اخیر تک اپنے انداز پر قائم رہا چنانچہ اس مقدس فرقہ میں کوئی ایسا شخص نہیں پیدا ہوا جو فلسفی یا معقولی کے لقب سے ممتاز ہوتا، لیکن دو شخص اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں، ابن تیمیہ اور ابن حزم، ان دونوں بزرگوں کے معتقدات اور خیالات اس امر کے اندازہ کرنے کے لئے نہایت نتیجہ خیز ہیں کہ حدیث کو فلسفہ سے کس حد تک ربط ہوسکتا ہے، یہ دونوں بزرگ بہت بڑے محدث اور سخت مذہبی آدمی تھے، انھوں نے گو فلسفہ میں کمال پیدا کیا تھا لیکن فلسفہ کو بالکل

حقیر سمجھتے تھے اور اسلئے فلسفہ کا ان پر کچھ اثر نہین پڑ سکتا تھا، چنانچہ ابن تیمیہ نے فلسفہ کے رد مین ایک ضخیم کتاب چار جلدوں میں لکھی، **ابن حزم** نے بھی متعدد کتابون مین فلسفہ کے مسائل رد کئے،

اہل سنت وجماعت مین عقائد کے اعتبار سے تین شاخیں ہیں، اشاعرہ، ماتریدیہ، محدثین، لیکن ایک مدت سے تمام اسلامی دنیا میں صرف اشاعرہ کی کتابیں متداول اور زیر درس ہین ماتریدیہ کے اقوال کہیں کہیں انھیں کتابوں میں آجاتے ہین لیکن محدثین کی تصنیفات سرے سے ناپید ہین اور انکے اقوال بھی بجز صفات باری کے کسی مسئلہ کے متعلق نہین پائے جاتے، حالانکہ اصول وعقائد کے متعلق سب سے زیادہ انہی کی رائین معتبر ہوسکتی ہین، اب خوش قسمتی سے اس مقدس گروہ کی تصنیفات کیطرف توجہ مبذول ہوئی ہی، چنانچہ ابن تیمیہ کی کتاب العقل والنقل اور منہاج السنۃ اور ابن حزم کی کتاب الملل والنحل حال میں چھپکر شائع ہوئی ہی، ہم اسوقت اسی کتاب الملل والنحل، پر تقریظ لکھنی چاہتے ہیں، لیکن اصل بحث سے پہلے ہم نہایت اختصار کیساتھ ابن حزم کے حالات لکھتے ہین،

ان کا نام علی بن احمد ابن سعید بن حزم ہے خاندان بنو امیہ سے تھے قرطبہ میں سنہ ۳۸۴ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۴۵۶ھ میں وفات پائی سنہ ۴۰۰ھ میں حدیث کی تحصیل شروع کی، علوم دینیہ کے ساتھ منطق وفلسفہ مین بھی کمال پیدا کیا، پہلے شافعی تھے پھر ظاہری ہوگئے یعنی ظواہر قرآن وحدیث کے سوا قیاس کو نہیں مانتے تھے، بہت سی کتابیں تصنیف کیں جنمیں سے محلّی بڑے پایہ کی کتاب ہی، انکی تصنیفات ۸۰ ہزار ورق مین ہین، امام غزالی نے لکھا ہی کہ مین نے انکی ایک تصنیف دیکھی ہے جس سے انکا کمال حفظ وذہانت ثابت ہوتی ہی،

ابن صاعد اندلسی لکھتے ہین کہ ابن حزم کو علوم اسلامیہ مین جو کمال تھا اندلس میں

کسی کو نہ تھا حمیدی کا بیان ہی کہ ہمنے ان کا نظیر نہین دیکھا، یہ تمام واقعات علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھے ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ ابن حزم علمای کبار میں ہیں اور اجتہاد کے تمام شرائط ان میں پائے جاتے تھے،

کتاب الملل والنحل اس کتاب مین مصنف نے فلاسفہ، ملاحدہ، مادیین، یہود، نصاری، غرض اکثر اہل مذاہب کے عقاید وخیالات نقل کیے ہیں اوران کا رد لکھا ہی غیر مذاہب کے رد میں علمای اسلام کی بہت سی تصنیفات ہیں، لیکن اس کتاب میں یہ خصوصیت ہے کہ دوسرونکے عقائد وخیالات کو نہایت تحقیق سے لکھا ہے توراۃ اور انجیل کے محرّف ہونے پر جو بحث کی ہی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مُصنّف کو یہود ونصاریٰ کی کتابون پر مجتہدانہ عبور تہا، غیر مذاہب کے ابطال کے بعد مصنف نے خود اسلامی عقاید سے بحث کی ہے اور ہر فرقہ کے اُن مسائل کا رد کیا ہے جو اسکے نزدیک غلط اور باطل ہیں، ہمکو صرف اسی حصہ سے بحث ہی، سب سے پہلے انبیاء کے مسئلہ کو لکھا ہے اور نہایت تفصیل سے لکھا ہے، عقائد کی موجودہ کتابوں میں اگرچہ عموماً یہ مسئلہ مسلم قرار پاگیا ہے کہ انبیاء معصوم ہیں لیکن اکثر تفسیر کی کتابوں میں جو روایتیں مذکور ہیں اور وہی تمام مسلمانوں میں پھیل گئی ہیں وہ بالکل اسکے خلاف ہیں، ابن حزم نے نہایت آزادی اور دلیری سے ان تمام روایتوں کی لغویت ثابت کی ہے حضرت داؤد کی نسبت مشہور ہے کہ انھوں نے ایکدن اتفاق سے اوریا کی بیوی کو نہاتے دیکھ لیا، چونکہ وہ نہایت حسین تہی اسلئے اس سے شادی کا ارادہ کیا، اور اسی غرض سے اُسکے شوہر کو لڑائی پر بھیجدیا جب وہ لڑائی میں مارا گیا تو اُسکی بیوی سے شادی کرلی، قرآن مجید میں ایک موقع پر یہ واقعہ مذکور ہی کہ دو بھائی حضرت داؤد کے پاس لڑتے ہوئے آئے کہ ہمارا مقدمہ فیصل کردیجیے جھگڑا یہ تہا کہ ایک بھائی کے پاس ۹۹ دنبے تھے اور دوسرے کے پاس صرف ایک، وہ کہتا تھا کہ اپنا دنبہ بھی مجکو دیڈالو، حضرت داؤد نے یہ سنکر کہا کہ یہ

ظلم ہے پھر انکو خیال ہوا کہ یہ خدا نے میرا امتحان لیا ہے، اکثر مفسرین لکھتے ہین کہ یہ دبی حضرت داؤد کا قصہ ہے، وہ دونون آدمی نہ تھے بلکہ فرشتے تھے اور انھوں نے اس پیرایہ میں حضرت داؤد کو متنبہ کیا کہ تمھارے ۹۹ بیبیاں ہین اور اوریا کی صرف ایک، وہ بھی تم نے چھین لی، ابن حزم لکھتے ہیں کہ وہ فرشتے نہ تھے بلکہ واقعی آدمی تھے اور وہ درحقیقت انفصال مقدمہ کے لیئے آئے تھے، ان کے الفاظ یہ ہین،

وہذا قول صادق صحیح لا یدل علی شیٔ مما قالہ المستہزؤن الکاذبون المتعلقون بخرافات ولّدہا الیہود وانما کان ذلک الخصم قوما من بنی آدم بلا شک مختصمین فی نعاج من الغنم علی الحقیقۃ ومن قال انہم کانوا ملائکۃ معرضین بامر النساء فقد کذب علی اللہ عزوجل وقال مالم یقل وزاد فی القرآن مالیس فیہ وکذب اللہ عزوجل۔

قرآن مجید کا بیان بالکل صحیح اور سچ ہے، اور وہ مسخرے جو یہودیوں کے خرافات کی سند پکڑتے ہیں انکے اقوال کی طرف اس آیت میں کچھ بھی اشارہ نہیں پایا جاتا، وہ دونون شخص واقعی آدمی تھے اور انہیں درحقیقت دنبوں کے متعلق جھگڑا تھا، جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ فرشتے تھے اور انھوں نے عورتوں کے قصہ کی طرف اشارہ کیا تھا تو وہ خدا کو جھوٹ لگاتا ہے اور وہ بات کہتا ہے جو خدا نے نہیں کہی اور قرآن پر حاشیہ چڑھاتا ہے اور خدا کو جھوٹا بناتا ہے،

اس کے بعد ابن حزم لکھتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں بدمعاش اور پاجیوں کی طرف منسوب کیجا سکتی ہیں، نہ کہ (نعوذ باللہ) انبیائے کرام کی طرف،

اسی طرح یہ واقعہ عام طور پر مشہور اور کتب تفسیر میں منقول ہے کہ حضرت سلیمان گھوڑوں کا جائزہ لے رہے تھے، اس میں اس قدر مشغول ہوئے کہ عصر کی نماز جاتی رہی، جب اُن کو خیال آیا تو گھوڑوں کی پنڈلیاں کٹوا ڈالیں، اور جب انکی دُعا سے آفتاب دوبارہ طلوع ہوا تو نماز عصر ادا کی، ابن حزم اس روایت کی نسبت لکھتے ہین،

وہذا خرافۃ موضوعۃ مکذوبۃ سخیفۃ باردۃ والظاہر انہا من اختراع زندیق بلا شک،	یہ خرافات، جھوٹ، بیہودہ، اور لغو روایت ہے، بظاہر یہ روایت کسی زندیق نے ایجاد کی ہے،

ایک بڑا مہتم بالشان مسئلہ جس پر ابن حزم نے نہایت تفصیل سے بحث کی ہے، سحر اور جادو کی حقیقت ہی یہ بحث اگرچہ درحقیقت سائنس سے تعلق رکھتی ہے، لیکن چونکہ سحر کا لفظ مذہبی کتابوں میں آگیا ہی اس لئے یہ ایک مذہبی مسئلہ بنگیا ہی، اس سے کسی کو انکار نہیں کہ سحر اور جادو کوئی چیز ہے لیکن بحث یہ ہی کہ سحر میں درحقیقت انقلاب ماہیت ہوتا ہے یا صرف شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی کا نام سحر ہے، اکثر اشاعرہ اس بات کے قائل ہیں کہ سحر کے ذریعہ سے تمام خرق عادات وجود میں آسکتے ہیں، اور عام طور پر یہی عقیدہ مسلمانوں میں پھیلا ہوا ہے، ابن حزم نے نہایت زور شور سے، اس کا انکار کیا ہی اور حسب ذیل دلیلیں پیش کی ہیں،

(۱) خدا نے کائنات کی جو ترتیب قرار دی ہے وہ بدل نہیں سکتی، جیسا کہ خود قرآن مجید میں ہے، لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ، علامۂ موصوف نے قرآن مجید کی متعدد آیتوں سے استدلال کرکے لکھا ہے،

فصح ان کل ما فی العالم مما قد رتبہ اللہ عز وجل الترتیب الذی لا یتبدل،	تو ثابت ہوا کہ جو کچھ عالم میں خدا نے ترتیب دیا ہے وہ بدل نہیں سکتا،

(۲) اگر سحر صحیح ہو تو معجزہ اور سحر میں کیا فرق ہوگا،

ویقال لمن قال ان السحر یحیل الاعیان ویقلب الطبائع اخبرونا اذا جاز ہذا فای فرق بین النبی والساحر ولعل جمیع الانبیاء کانوا سحرۃ کما قال فرعون عن موسیٰ علیہ السلام	جو شخص یہ کہتا ہی کہ جادو قلب ماہیت کر دیتا ہی تو اس سے کہنا چاہیئے کہ پیغمبر اور جادوگر میں کیا فرق باقی رہیگا اس صورت میں یہ احتمال پیدا ہوگا کہ تمام انبیاء جادوگر ہی تھے جیسا کہ فرعون نے حضرت موسیٰ کی

انہ لکبیرکم الذی علمکم السحر،	نسبت کہا تھا کہ یہ بڑا جادوگر ہی جس نے تمکو جادو سکھایا ہے

سحر کے ثبوت میں اکثر لوگ فرعون کے جادوگروں کا واقعہ پیش کہتے ہیں جو قرآن مجید میں مذکور ہے علامہ موصوف نے قرآن مجید کی متعدد آیتوں سے ثابت کیا ہی کہ وہ صرف شعبدہ بازی تھی وہ آیتیں یہ ہیں،

یُخَیَّلُ الیہ من سحرھم انھا تسعیٰ	حضرت موسیٰ کو انکے جادو کیوجہ سے خیال ہوتا تھا کہ انکی
انما صنعوا کید ساحر،	رسیاں اور لاٹھیاں دوڑ رہی ہیں ان لوگوں نے جادوگر کا کرتب کیا ہے

پہلی آیت سے ثابت ہوا کہ وہ صرف تخیل تہا کوئی واقعی چیز نہ تھی، دوسری آیت میں کید کا لفظ ہے جسکے معنی فریب کے ہین،

قرآن مجید میں ہاروت و ماروت کے متعلق مذکور ہے کہ لوگ ان سے جادو سیکھتے ہین اور اسکے ذریعہ سے میاں اور بیوی میں جدائی کرا دیتے ہین، اس آیت سے بھی سحر کی واقعیت پر استدلال کیا جاتا ہی، علامہ موصوف اسکے جواب میں لکھتے ہین،

فھذا امر ممکن یفعلہ النمام	یہ ممکن بات ہی جسکو چغلخور بھی کرسکتا ہی یعنی میاں بیوی میں لڑائی کرا دینا چغل خوری کے ذریعہ سے ہوسکتا ہی۔

ایک حدیث میں ہی کہ آنحضرتؐ پر لبید ابن اعصم نے جادو کردیا تھا جسکی وجہ سے آپ کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ جو کام آپ نے نہیں کیا ہوتا تھا، اسکی نسبت آپ کو خیال ہوتا تھا کہ کر لیا ہی، اس حدیث کے جواب میں علامہ موصوف لکھتے ہین،

فلیس فی ھذا ایضاً احالۃ الطبیعۃ ولا قلب عین وانما ھو تاثیر بقوۃ تلک الصناعۃ ونحن نجد الانسان یسب او یقابل بحرکۃ لیغضب منھا فیستحیل من الحلم الی الطیش وعن السکون الی الحرکۃ،	اسمیں بھی طبیعت کا بدلنا یا قلب ماہیت نہین ہی، ہم دیکھتے ہین کہ جب آدمی کو کوئی شخص گالی دیتا ہی یا کوئی ایسی بات کرتا ہی جس سے اسکو غصہ آجائے تو اُسکا حلم غصہ سے اور سکون حرکت سے بدل جاتا ہی،

فلسفۂ حال سے مسائل مین سب سے زیادہ جو مسلم الثبوت مسئلہ مانا جاتا ہی،
قانون قدرت کا مسئلہ ہی اور کچھ شک نہیں کہ اس سے زیادہ کوئی چیز قطعی اور یقینی نہین، لیکن عام خیال یہ پھیلا ہوا ہے کہ یہ مسئلہ زمانۂ حال کی تحقیقات مین سے ہی یا کم از کم یہ کہ پہلے اس مسئلہ کیطرف خیال رجوع نہین ہوا تھا، اور اسی لیے قدیم لٹریچر مین یہ اصطلاح موجود نہین، لیکن یہ خیال تمامتر غلط ہے فلاسفۂ اسلام تو عموماً اسکے قائل تھے، فقہاء اور محدثین میں بھی اشاعرہ کے سوا اسکا کوئی منکر نہین چنانچہ ابن تیمیہ نے اپنی تصنیفات میں نہایت تصریح سے اسکو لکھا ہے،

علامہ ابن حزم نے اس بحث پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے جسکے الفاظ یہ ہین "الکلام فی الطبائع"[1] اس بحث میں پہلے اشاعرہ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ طبائع کے قائل نہین، پھر نہایت تفصیل سے اسکا رد لکھا ہے انکی تقریر کا ماحصل یہ ہی کہ عرب میں متعدد الفاظ تھے جو اس معنی مین استعمال کئے جاتے تھے مثلاً طبیعۃ، خلیقۃ، غریزۃ، سجیۃ، جبلۃ، چنانچہ حمید بن ثور کہتا ہے،

لکلّ امرئٍ یا امّ عمرو طبیعۃٌ	وتفریق ما بین الرجال الطبائع
اے ام عمرو! ہر شخص کی ایک فطرت ہوتی ہی،	اور آدمیون میں جو فرق ہی وہ فطرتون ہی کا ہی،

یہ الفاظ آنحضرت اور صحابہ کے سامنے استعمال کیے گئے اور کسی نے ان سے انکار نہین کیا، بلکہ خود آنحضرت نے یہ الفاظ استعمال فرمائے صحابہ میں سے ایک بزرگ نے آنحضرت سے پوچھا کہ مجھ مین جو حلم اور بردباری پائی جاتی ہی وہ میری جبلت ہی یا تربیت اور کسب سے حاصل ہوئی ہے، آپ نے فرمایا نہین بلکہ خدا نے تمکو اسپر مجبول کیا ہی،

اس استدلال کے بعد علامۂ موصوف لکھتے ہین،

---

[1] ملل ونحل جزو ثالث صفحہ ۱۱ مطبوعہ مصر

وکل ہذہ الطبائع والعادات مخلوقۃ خلقہا اللہ عز وجل فرتّب الطبیعۃ علی انہا لاتستحیل ابداً ولا یمکن تبدلہا عند کل ذی عقل کطبیعۃ الانسان بان یکون ممکناً لہ التصرف فی العلوم والصناعات ان لم یعترضہ آفۃ، وطبیعۃ الحمیر والبغال بانہ غیر ممکن منہا ذلک وکطبیعۃ البرآن لاینبت شعیرا ولا جوزاً وہٰکذا کل ما فی العالم مقرون بالصفات وہی الطبیعۃ نفسہا،

اور یہ تمام طبائع اور عادات خدا نے پیدا کئے ہین اور طبائع کو اسطرح بنایا ہے کہ وہ کسی طرح بدل نہیں سکتے اور اسکا بدلنا کسی عاقل کے نزدیک ممکن نہین مثلاً انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ اگر کوئی آفت نہ آوے تو وہ علوم اور ہنر سیکھ سکتا ہے، اور گدھے اور خچر کی فطرت ایسی بنائی کہ ان سے یہ امور ممکن نہین اسیطرح گیہون سے جو یا اخروٹ نہیں پیدا ہو سکتا غرض دنیا میں جتنی چیزین ہیں انمین جو صفتین پائی جاتی ہین کہ وہی انکی فطرت ہے،

اس کتاب مین بعض خیالات بالکل جدید ہیں مثلاً یہ بحث کہ عورتین پیغمبر ہوسکتی ہین یا نہین، اسکے متعلق ہمکو جہانتک معلوم ہے آجتک کسی نے اسبات کا پہلو نہین لیا تھا لیکن علامہ ابن حزم کا دعوی ہے کہ عورتیں پیغمبر ہو سکتی ہین، چنانچہ اس بحث کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے اور قرآن مجید کی متعدد آیتوں سے اسپر استدلال کیا ہے عام خیال یہ ہے کہ عورتوں کا درجہ مردوں سے کم ہے، لیکن علامہ ابن حزم اس کے خلاف ہیں صحابہ کی فضیلت پر جہاں بحث کی ہے وہاں اس مسئلہ کو بھی تفصیل سے لکھا ہے اور قرآن مجید کی جن آیتون سے مردون کی فضیلت ثابت ہوتی ہے انکا جواب دیا ہے (دیکھو جزو چہارم صفحہ ۱۳۰) علامہ موصوف کا یہ خیال صحیح ہو یا نہو، لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے زمانہ کے تعلیم یافتہ حضرات کے ہمخیال، پہلے بھی موجود تھے،+

یونانی منطق کی غلطیاں

اہل منطق نے ادراک معلومات سے دو مختلف طریقے قرار دیے ہیں معرف و حُجّۃ اور اسکی وجہ یہ بیان کی ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں تصور اور تصدیق اور چونکہ یہ دونوں دو مختلف قسم کے ہیں، اسلیئے ان کے ادراک طریقے بھی مختلف ہیں جنکا نام معرف و حُجّۃ ہی لیکن غور کرنا چاہیئے کہ جس چیز کو ہم معرف کہتے ہیں وہ تصور ہے یا تصدیق، اس سوال کے جواب دینے سے پہلے ہمکو یہ دیکھنا چاہیئے کہ معرف کیونکر حاصل ہوتا ہے یعنی کسی شے کی حقیقت ہم کیونکر معلوم کرتے ہیں، اسکا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہم اسبات کا پتہ لگاتے ہیں کہ اس شے مین کیا کیا چیزیں پائی جاتی ہیں پھر یہ دیکھتے ہیں کہ انمیں کیا کیا چیزیں ایسی ہیں جو اور اشیا میں بھی مشترک ہیں، اور کیا چیزیں ہیں جو اُسی کے ساتھ خاص ہیں، پھر یہ دیکھتے ہین کہ یہ چیزیں اِس شے کی ذات میں داخل ہیں، یا اسکے خارجی اوصاف ہیں، اسطرح اقسام ذیل پیدا ہوتے ہین،

ذاتی، یعنی وہ چیزین جو کسی شے کی اصل حقیقت میں داخل ہین،

عرضی، جو خارج ہین،

فصل، یعنی وہ ذاتی جو اُس شے کے ساتھ خاص ہے،

جنس، یعنی وہ ذاتی جو اور چیزونمیں بھی مشترک ہی،

عرض عام، یعنی وہ عرضی جو اوروںمیں بھی مشترک ہے،

خاصہ، یعنی وہ عرضی جو اسی شے کے ساتھ خاص ہے،

جب اسطرح ایک شے کے تمام ذاتیات و عرضیات معلوم ہو جاتے ہین تو ہم انکو ترکیب دیتے ہین اور یہی مرکب اِس شے کا معرف ہوتا ہی،

اب غور کرو کہ معرف کے حاصل کرنے میں کن مقدمات سے کام لینا پڑتا ہے، اسکی تفصیل یہ ہے

۱- اس شے میں فلان فلان چیزیں پائی جاتی ہیں،

۲- فلان فلان چیزیں اُس شے کی ذاتی ہیں- اور فلان عرضی،

۳- ذاتیات میں فلان چیزیں فصل ہیں، اور فلاں خاصہ، اور فلان عرض عام، یہ تمام مقدمات قضا اور تصدیقات ہیں، اسلیئے معرف دراصل تصدیقات سے حاصل ہوتا ہے نہ تصورات سے شاید یہ کہا جائے کہ معرف گو حاصل تصدیقات سے ہوتا ہے، لیکن خود تصور ہے لیکن یہ صحیح نہیں منطق کا یہ مسئلہ مسلمہ ہے کہ جو علم قضایا کے ترتیب دینے سے حاصل ہوتا ہے وہ تصدیق ہوتا ہے، اور یہ ثابت ہوچکا کہ معرف کا علم قضایا سے حاصل ہوتا ہے،

شاید کہا جائے کہ معرف گو قضایا سے ہوتا ہے اور گو وہ ابتدائی درجہ میں خود بھی قضیہ اور تصدیق ہوتا ہے، لیکن ہم معرف اس سادہ تصور کا نام رکھتے ہیں جو اس قضیہ کے بعد حاصل ہوتا ہے، مثلاً جب ہم انسان کی حقیقت معلوم کرنی چاہتے ہیں تو ترتیب مقدمات کے بعد ہم کہتے ہیں کہ انسان کی حقیقت حیوان ناطق ہے، اسوقت تک یہ ایک جملہ اور ایک قضیہ ہے، لیکن اسکے بعد ہم جسطرح انسان کا سادہ تصور کر سکتے ہیں اسیطرح حیوان ناطق کا بھی سادہ تصور ہوسکتا ہے اور اسی کا نام معرف ہے لیکن اگر اس بنا پر معرف کو تصور کہا جا سکتا ہے تو حُجّت اور تصدیق کو بھی تصور کہنا چاہیئے، کیونکہ مثلاً جب مقدمات کی ترتیب کے بعد ہمکو یہ علم ہوتا ہے کہ عالم حادث ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ گو اسوقت تک یہ قضیہ ہے لیکن اسکے بعد یہ قضیہ ایک سادہ تصور بن جاتا ہے یعنی حدوثِ عالم کا تصور، اسوقت ہمارے ذہن میں حدوثِ عالم کا خیال قضیہ اور تصدیق کی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ جس طرح مرکبات اضافی کا تصور ہوتا ہے اسیطرح حدوثِ عالم کا بھی تصور ہے،

حقیقت یہ ہے کہ معرف کے ادراک میں اگر یہ حیثیت ملحوظ نہو کہ وہ فلان شے کی

حقیقت اور حد ہے تو وہ معرف نہیں بلکہ مُعرّف ہی، اس بنا پر معرف کا ادراک جو ہمکو ہوتا ہے وہ تصدیق اور قضیہ کی صورت میں ہوتا ہے اور یُوں اسکو تصور کی صورت میں لانا چاہیں تو ہر قضیہ بھی تصور کی صورت میں لایا جاسکتا ہی مثلاً خدا ایک ہی، عالم حادث ہے، انسان ناطق ہے، اِن سب قضایا کو اِس صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ خدا کی وحدانیت، عالم کا حدوث، انسان کا نطق، اِس صوت میں یہ سب تصورات بنجائینگے،

امام رازی کا جو یہ مذہب ہے کہ تصورات نظری نہین ہوتے اُسکی یہی بنیاد ہی کیونکہ نظر اور فکر کے لیئے ضرور ہے کہ مقدمات اور قضایا کی ترتیب سے کام لیا جائے، اِس صورت میں تصور تصور نہین رہیگا بلکہ تصدیق بنجائیگا!

معرف اور حد کے متعلق اہل منطق نے جو نکتہ آفرینیان اور دقت پسندیان کین ہین انمین سے اکثر کوہ کندن اور کاہ برآوردن ہین،

سرسری بات یہ ہی کہ بارہ سو برس سے آجتک معرف اور حد تام کیلئے انسان اور حیوان ناطق کے سوا کوئی مثال نہ پیدا ہوسکی، اس مثال پر کئی قرن گذر گئے اور اسکے چھوڑنے کی جرأت اسوجہ سے نہین ہوئی کہ دوسری کوئی مثال جس پر معرف کی تعریف صادق آنے کا پورا اطمینان ہو نصیب نہیں ہوئی، لیکن غور سے دیکھو یہ دو ہزار سالہ مثال بھی صحیح ہی یا نہین؟ انسان کی حد تام حیوان ناطق بتائی جاتی ہے اور حیوان کو جنس قریب اور ناطق کو فصل قریب کہا جاتا ہی، لیکن سوال یہ ہی کہ ناطق کے کیا معنی ہین؟ اہل منطق نے دریابندۂ معقولات سے اسکی تعبیر کی ہی، اب سوال یہ ہی کہ ناطق کی حقیقت میں حیوانیت داخل ہی یا نہین؟ اگر نہین ہی تو ملائکہ اور عقول مجردہ میں بھی نطق پایا جاتا ہی کیونکہ اُنسے بڑھکر دریابندۂ معقولات کون ہوسکتا ہی، اس صورت مین ناطق فصل نہیں بلکہ جنس ہوگا۔ کیونکہ جو ذاتی اور دو نہین یا مشترک ہو وہ جنس ہی، نہ فصل، اور اگر ناطق کی

حقیقت میں حیوانیت داخل ہی تو اولاً تو معرف میں حیوان کا داخل کرنا بیفائدہ ہوگا، دوسرے یہ کیونکر ثابت کیا جا سکتا ہے کہ حیوانات میں ادراکِ معقولات نہیں ادراکِ معقولات کے معنی جزئیات سے کلیات کا استنباط کرتا ہے اور یہ قوت کم و بیش اکثر حیوانات میں پائی جاتی ہے،

ان اعتراضات سے بچنے کیلئے قدمائے منطقین نے ایک قید اور اضافہ کی تھی یعنے مرنے والا ناطق اور چونکہ اُنکے نزدیک عقول مجردہ کو فنا نہیں اسلیئے وہ اِس تعریف میں داخل نہیں ہو سکتے لیکن اس تعریف کی بنا پر قیامت میں جب دوبارہ آدمی پیدا ہونگے تو وہ انسان نہ ہونگے، کیونکہ اعتقادات مسلمہ کے بموجب دوسری زندگی سے پھر فنا نہیں،

اصل غلطی جو اس باب میں اہل منطق نے کی ہی وہ وہ معرف کی قید میں جنس قریب اور فصل کا لازم کرنا ہی متکلمین اسلام معرف کیلئے اسقدر کافی سمجھتے تھے کہ ایک چیز کے وہ تمام اوصاف بیان کیے جائیں جو الگ الگ اوروں میں بھی پائے جاتے ہوں لیکن اُن کا مجموعہ اس چیز کے سوا کسی اور چیز میں نہ پایا جائے۔ بخلاف اسکے یونانیوں کے نزدیک حد تام کے لیئے حسب ذیل اُمور ضروری ہین،

(۱) ایک شے کے تمام ذاتیات ذکر کیئے جائین جو اُسمیں اور اوروں میں مشترک ہوں،

(۲) وہ ذاتی ذکر کیا جائے جو اُس شے کے سوا اور دنمیں نہ پایا جاتا ہو،

اسمیں پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ذاتی اور عرضی کی تمیز نہایت مشکل ہی اور اسکو خود بو علی سینا نے تسلیم کیا ہے اور سچ یہ ہے کہ مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے،

دوسرا امر یہ ہے کہ تمام ذاتیات کا کون احاطہ کر سکتا ہی، جدید تحقیقات کی رو سے جن چیزونکو بسیط خیال کیا جاتا تھا مرکب ثابت ہو گئیں۔ اور مرکبات کے جسقدر اجزا پہلے قرار پائے تھے اُس سے بہت زیادہ نکل آئے۔ غرض حد تام میں جنس قریب کی قید

لگائی اور جنس قریب کی یہ تعریف کرنی کہ تمام اجزار مشترکہ کا مجموعہ ہو، حد تام کو عنقا بنانا ہی،

ذاتی و عرضی

تصورات سکے اکثر مسائل ذاتی و عرضی کی تفریق پر مبنی ہین، اسلئے پہلے اسپر غور کرنا چاہیئے کہ یہ تفریق صحیح ہی یا نہین۔ ذاتی کی یہ تعریف کیگئی ہی کہ شے کی نفس حقیقت میں داخل ہو اور شے کا تصور تام بغیر اُسکے تصور کے نہو سکتا ہو۔ مثال میں اسکو یون سمجھو کہ مثلاً انسان میں مختلف اوصاف پائے جاتے ہیں، چلتا ہے، پھرتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، ہنستا ہے، روتا ہے، انمیں بعض اوصاف ایسے بھی ہیں جو اور جانوروں میں نہیں پائے جاتے لیکن اگر ان سب سے قطع نظر کریں۔ تب بھی انسان کا وجود باقی رہتا ہے، بخلاف اسکے اگر حیوانیت اور گویائی سے قطع کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے یعنی اگر یہ نہوں تو انسان بھی نہوگا، اسلیئے چلنا پھرنا وغیرہ انسان کی عرضیات میں ہے اور حیوانیت اور گویائی۔ ذاتیات میں ہین، اس بنا پر ذاتی کی یہ تعریف ٹھہری کہ "ماہیت کا وجود بغیر اسکے نہ پایا جاسکے" "یا یہ کہ ماہیت کا تصور تام بغیر اسکے نہ ہو سکے" اسپر اعتراض یہ ہی کہ اس صورت میں دَور لازم آتا ہی مثلاً ہم کسی شے کی حقیقت دریافت کرنا چاہیں تو اسکا یہ طریقہ ہے کہ اسکے ذاتیات دریافت کریں اور ذاتیات کے دریافت کرنیکا یہ طریقہ ہی کہ ہم یہ دیکھیں کہ اس شے میں ایسی کیا چیزیں پائی جاتی ہیں جو نفس حقیقت میں داخل ہیں اور جنکے بغیر اسکا وجود اور تصور نہیں ہو سکتا، لیکن ابھی تو ہمکو اُس شے کی حقیقت ہی معلوم نہیں، اسلئے ہم کیونکر جان سکتے ہیں کہ کونسی چیزیں نفس حقیقت میں داخل ہیں، جنکے بغیر اسکا وجود اور تصور نہیں ہوسکتا ابھی ہمکو اس شے کی حقیقت ہی معلوم نہیں اس لیئے ہم کیونکر جان سکتے ہیں کہ کونسی چیزیں نفس حقیقت میں داخل ہیں اور کونسی خارج،

مختصر یہ کہ ماہیت سے علم کے لیئے ذاتی کا علم ضروری ہی اور ذاتی علم کے لیئے ماہیت کا علم ضروری ہے کیونکہ جب تک ماہیت متعین نہو چکے یہ کیونکر فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ فلاں چیز اسکی ماہیت میں داخل ہے اور فلاں چیز خارج، اسی بنا پر جن اشیار کی

حقیقت میں اختلاف ہی یعنی ایک شخص انکی حقیقت اور کچھ بیان کرتا ہے اور دوسرا کچھ اور، انکے ذاتیات میں بھی اختلاف ہے، ایک شخص اُسکے ذاتیات کچھ اور بیان کرتا ہے اور دوسرا کچھ اور، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب تک ایک چیز کی نسبت یہ فیصلہ نہو جائے کہ اسکی حقیقت تام کیا ہے، اسوقت تک یہ بھی فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے ذاتیات کیا ہیں،

قیاس | اہل منطق کا مذہب ہے کہ قیاس ہمیشہ دو یا زیادہ قضایا سے مرکب ہوتا ہے یعنی صرف ایک قضیہ سے استدلال نہیں کیا جاسکتا، اسپر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اکثر دلائل میں صرف ایک قضیہ مذکور ہوتا ہے، مثلاً ہم کہتے ہیں کہ اسوقت دن ہی کیونکہ اسوقت آفتاب نکلا ہوا ہے، اس صورت میں صرف ایک مقدمہ سے استدلال ہی، اہل منطق کہتے ہیں کہ یہاں کبریٰ محذوف ہے، اصل استدلال یوں ہے کہ اسوقت آفتاب نکلا ہوا ہے اور جب آفتاب نکلا ہوتا ہے تو دن ہوتا ہے، لیکن چونکہ کبریٰ سہلۃ الحصول اور بدیہی ہے اسلیئے اسکو ذکر نہیں کرتے اور صرف صغریٰ پر اکتفا کرتے ہیں،

اس مقدمہ کی تحقیق کیلیئے ہمکو مقدمات ذیل سے کام لینا چاہیئے،

۱۔ اہل منطق نے خود تسلیم کیا ہے کہ اکثر صورتوں میں محض لازم کے تصور سے ملزوم کا تصور ہوجاتا ہے مثلاً جب ہم دھوئیں کو دیکھتے ہیں تو ہمکو فوراً خیال ہوتا ہے کہ یہاں آگ ہے، اس صورت میں ممکن ہی کہ ذریعہ علم یہ قیاس منطقی ہو کہ یہاں دھواں ہے، اور جہاں دھواں ہوتا ہے وہاں آگ ہوتی ہی لیکن یہ مقدمات ہمارے ذہن میں بالکل خطور نہیں کرتے بلکہ دھوئیں کے دیکھنے کے ساتھ ساتھ آپ سے آپ آگ کا خیال دلمیں آجاتا ہے اور ترتیب مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی۔

۲۔ یہ امر مسلم ہے کہ اکثر قضایا کا علم بہت سے ابتدائی مقدمات کے جاننے پر موقوف

ہوتا ہے امثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ عالم متغیر ہے، اور جو متغیر ہے حادث ہے تو ہم سمجھتے
ہیں کہ حدوث عالم کے علم کے لیے صرف ان دو مقدموں کا علم کافی ہے لیکن در حقیقت
یہاں اور بہت سے مقدمات ہیں جن کے جاننے کے بغیر حدوث عالم علم نہیں ہو سکتا
مثلاً یہ کہ جو چیز عام کے لیے ثابت ہوگی ضرور ہے کہ خاص کے لیے بھی ثابت ہو کیونکہ اگر
یہ مسئلہ ہمکو معلوم نہ ہو تو ہم قیاس سے نتیجہ پیدا کر سکیں گے الیکن با وجود اسکے جب حدوث
عالم پر اسطرح استدلال کیا جاتا ہے کہ عالم متغیر ہے اور جو متغیر ہے حادث ہے تو صرف
یہی دو مقدمات کافی سمجھے جاتے ہیں اور یہ نہیں کہا جاتا کہ یہاں ایک مقدمہ اور بھی ہے جو
جو محذوف ہے، اسکی وجہ یہی کہ گو یہ مقدمہ حقیقت میں ہمارے خیال میں موجود ہے تاہم چونکہ
استدلال کیوقت وہ بصراحت صاف ہمارے پیش نظر نہیں ہوتا اور ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ہم
استدلال کے وقت اس سے کام لے رہے ہیں اسلیے استدلال کیلیے صرف وہی دو مقدمات
کافی سمجھے جاتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ استدلال میں صرف یہ امر ملحوظ ہوتا ہے کہ کونسے
سے مقدمات ہمارے پیش نظر ہیں، باقی وہ مقدمات جنکی طرف ہمارے ذہن کو بالذات التفات
نہیں ہے گو وہ ہمارے ذہن میں موجود ہیں اور در اصل انہی کی مدد سے ہم استدلال کر رہے
ہیں، استدلال میں محسوب نہیں ہوتے، اب جبکہ یہ مسلم ہے کہ محض لازم کے تصور سے
ملزوم کا تصور ہو سکتا ہے اور دیگر مقدمات کے ترتیب کی ضرورت نہیں پڑتی تو ہم کہہ سکتے
ہیں کہ بہت سی صورتوں میں صرف ایک قضیہ استدلال کیلیے کافی ہو سکتا ہے مثلاً اگر ہم
آفتاب کے طلوع ہونے پر استدلال کرنا چاہیں تو صرف یہ کہنا کافی ہے کہ دن نکلا ہوا ہے
اس صورت میں صرف صغریٰ کافی ہے اکبریٰ کی کوئی ضرورت نہیں اکیونکہ یہ مسلم ہے کہ
محض لازم کا تصور ملزوم کے تصور کے لیے کافی ہے، اسلیے جب ہم نے کہا کہ دن نکلا
ہوا ہے تو ہمنے لازم یعنی دن کا ذکر کیا اور لازم کا ذکر ملزوم کے تصور کے لیے کافی ہے

حسن بن موسیٰ نوبختی نے کتاب الآراء والدیانات میں لکھا ہے وقد یستدل الانسان

اذا شاهد الاثر علی ان له موثرا والکتابة علی ان له من غیر ان یحتاج فی استدلاله علی صحة ذلک الی التعقل متین یہی وجہ ہے کہ تمام آدمی روزانہ کاروبار میں ہر وقت صرف صغریٰ سے استدلال کرتے ہین، کبریٰ کا کبھی کو خیال بھی نہیں آتا، ایک جاہل سے پوچھو کہ زراعت کیوں نہیں ہوئی وہ کہیگا کہ پانی نہیں ہوا اور صرف اسقدر کہنا نتیجہ کا مستلزم ہوگا کیونکہ زراعت کا نہونا پانی کے نہونے کیلیے لازم ہے،

باقی یہ دعویٰ کہ گو کبریٰ کا ذکر نہیں کیا جاتا لیکن وہ مرکوز فی الذہن ہے تو ہر قسم کے قیاسات میں یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ انمیں اور بہت سے مقدمات مرکوز فی الذہن ہین، اس امر کے فیصلہ کیلئے کہ دلیل کن مقدمات پر موقوف ہے یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ سلسلہ بسلسلہ اس توقف کا سلسلہ کہان تک پہونچتا ہے بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ جسوقت ہمکو ایک نتیجہ کا ادراک ہوا تو کون سے مقدمات بالذات ہمارے پیش نظر تھے، جب ہم یہ کہتے ہین کہ آفتاب نکلا ہے کیونکہ دن نکلا ہوا ہے، تو ہمکو صاف نظر آتا ہے کہ آفتاب نکلنے کا ادراک ہمکو دن کے ادراک کیوجہ سے ہوا ہے، اسکے سوا اور کوئی مقدمہ پیش نظر نہیں ہوتا،

شکل اول اثبات مطالب مین سب سے زیادہ شکل اوّل بکار آمد ہے، دوسری شکلوں کا انتاج اسی بنا پر ہے کہ وہ شکل اول کی صورت میں بدل سکتی ہیں لیکن شکل اول بھی اکثر صورتوں میں بیفائدہ ثابت ہوتی ہے، شکل اول کے انتاج کا مدار اسپر ہے کہ پہلے عام کیلئے ایک حکم ثابت کرتے ہین، پھر ایک چیز کو اس عام کے تحت میں داخل کرتے ہیں، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ حکم اس خاص کو بھی ثابت ہے، مثلاً جب یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ عالم حادث ہے، تو کہتے ہین۔ العالم متغیر، وکل متغیر حادث، اس شکل میں متغیر عام ہے اور عالم خاص، پہلے متغیر کے لیے حدوث ثابت کیا، پھر یہ ثابت کیا کہ عالم متغیر کے افراد مین ہے اسلیے نتیجہ یہ نکلا کہ عالم بھی حادث ہے، غرض شکل اوّل کا ماحصل یہ ہے کہ پہلے عام کے لیے کلیتہً ایک حکم ثابت کیا جائے۔ پھر اسکے ذریعہ سے وہی حکم خاص پر منتقل کیا جاسکے،

اس بنا پر شکل اول میں کبریٰ کا موجبہ کلیہ ہونا ضروری ہے اور اسلیے غور طلب یہ ہے کہ موجبہ کلیہ کیونکر بنتا ہے، اسکے صرف تین طریقے ہیں،

(۱) محمول موضوع کا ذاتی ہو، کیونکہ اس صورت میں موضوع کا ہر فرد خواہ مخواہ محمول کے ساتھ متصف ہوگا،

(۲) ذاتی نہو لیکن استقرار سے یہ معلوم کیا گیا ہو کہ موضوع کا ہر فرد محمول کے ساتھ متصف ہے استقرار کے ذریعہ سے جو کلیہ قائم ہوگا اسکا کبریٰ بنانا بالکل بیکار ہوگا، کیونکہ استقرا کے ذریعہ سے حد اوسط کے تمام افراد کا پہلے احاطہ ہوچکا ہے اور انہی افراد میں اصغر بھی ہے، مثلاً اگر ہم سرکہ کے بارد ہونے پر اسطرح استدلال کریں کہ سرکہ کھٹا ہے اور کھٹی چیز بارد ہے، اسلیے سرکہ بارد ہے، تو یہ استدلال بالکل لغو ہوگا کیونکہ استقرار کے ذریعہ سے سرکہ کا بارد ہونا ہمکو پہلے ہی معلوم ہوچکا ہے، اسلیے استقرار کے یہی معنی ہیں کہ تمام کھٹی چیزوں کا حال معلوم کیا جائے جن میں سرکہ بھی داخل ہے، اگر استقرار کیوقت سرکہ کا دریافت کرنا رہگیا تو استقرا صحیح نہیں ہوا، اور جب سرکہ کا بارد ہونا ہمکو جزئی حیثیت سے معلوم ہوچکا تو اب کیا ضرورت ہے کہ اسکو ایک کلی کے تحت میں داخل کر کے اسکے بارد ہونے کا علم حاصل کیا جائے۔

حاصل یہ کہ استقرار میں جزئیات کا علم پہلے حاصل ہوتا ہے پھر اس سے کلیہ قائم ہوتا ہے، اس بنا پر شکل اول میں جب کبریٰ استقرائی ہوگا تو شکل اول بیکار ہوگی کیونکہ استقرار کے ذریعہ سے اصغر کا اکبر کے ساتھ متصف ہونا پہلے ہی معلوم ہوچکا ہے اب شکل اول کے ذریعہ سے اسکے معلوم کرنیکی کیا ضرورت ہے مثلاً تمنے یہ ثابت کرنا چاہا کہ انسان ماشی ہے اور اسکے لیے دلیل یہ قائم کی کہ انسان حیوان ہے اور تمام حیوان ماشی ہیں تو سوال یہ ہوگا کہ تمنے تمام حیوانات کا ماشی ہونا کیونکر معلوم کیا؟ تم کہوگے کہ استقرار سے یعنی ہر قسم کے حیوانات دیکھے ہیں اور سب میں یہ صفت مشترک پائی اسلیے یہ کلیہ

قائم کیا کہ تمام حیوانات ماشی ہوتے ہیں لیکن حیوانات میں انسان بھی تھا تو تمنے انسان کا بھی تجربہ کیا ہوگا، اور اسمیں بھی یہ صفت پائی ہوگی، اس سے ثابت ہوا کہ انسان کا ماشی ہونا تمکو پہلے معلوم ہوا اور حیوان کا ماشی ہونا اُسکے بعد، اور جب انسان کا ماشی ہونا پہلے معلوم ہو چکا تو اب اسکی کیا ضرورت ہے کہ تم اس ذریعہ سے انسان کا ماشی ہونا ثابت کرو کہ وہ حیوان کے تحت میں داخل ہے، ایسا کرنا صرف بیفائدہ نہیں بلکہ اسمیں دور لازم آتا ہے،

دوسری صورت میں یعنی جبکہ محمول موضوع کا ذاتی ہو **شکل اوّل** بیکار ہوگی کیونکہ اس صورت میں ضرور ہے کہ محمول، اصغر کا جزو ہو اور حد اوسط عام ہو مثلاً کل انسان حیوان و کل حیوان حساس اس مثال میں انسان کا حساس ثابت کرنا مقصود ہی، اسکو تمنے یوں ثابت کیا کہ ہر انسان حیوان ہے اور ہر حیوان حساس ہے، اس لیئے ہر انسان بھی حساس ہے، اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ جب صغریٰ میں تمکو یہ معلوم ہوا کہ ہر انسان حیوان ہے تو اسی وقت تمکو یہ بھی معلوم ہو چکا کہ ہر انسان حساس ہے کیونکہ حساس ہونا خود انسان کی حقیقت میں داخل ہے اور اسکا جزو ہے اسلیئے یہ کیونکر ممکن ہو کہ تمکو کل کا علم ہو اور جزو کا نہو انسان کا حساس ہونا، پہلے معلوم ہوتا ہے تب اسکا حیوان ہونا معلوم ہوتا ہے اسلیئے اگر صغریٰ یعنی انسان کا حیوان ہونا تمکو معلوم ہے تو اسکا حساس ہونا بدرجۂ اولیٰ معلوم ہوگا، اس صورت میں کبریٰ کے ساتھ ترکیب دینے کی کیا ضرورت ہے،

حقیقت یہ ہے کہ شکل اول صرف اس صورت میں مفید ہوتی ہے جب کبریٰ کا علم تقلیدی ہوتا ہے، مثلاً ایک طبیب نے ہمسے کہا کہ تمام کھٹی چیزیں بارد ہوتی ہیں، ہمنے اسکو تسلیم کر لیا، اب جو چیز ہمکو کھٹی نظر آئیگی ہمکو یقین ہو جائیگا کہ وہ بارد ہے، کیونکہ ہمنے اس کلیہ کو اپنی تحقیقات اور استقرار سے معلوم نہیں کیا اسلیئے ہمنے اسکے ہر فرد کا احاطہ نہیں کیا اور اسلیئے ہمکو سرکہ کا بارد ہونا پہلے سے معلوم نہ تھا جب ہمنے اسکو کھٹا پایا،

تو فوراً یہ مقدمات ذہن میں آئیں گے کہ یہ کھٹا ہے اور جتنی چیزیں کھٹی ہوتی ہیں سب بارد ہوتی ہیں اسلیئے یہ بارد ہے،

جن صورتوں میں صغری اور کبری دونوں بدیہی ہوں اس صورت میں شکل اول محض بیکار ہوگی (حالانکہ اہل منطق کے نزدیک ایسی صورتوں میں شکل اولی زیادہ بکار آمد ہوتی ہے، کیونکہ اصغر کا حد اوسط کے ساتھ متصف ہونا بدیہی ہے) تو اکبر کے ساتھ اور بھی زیادہ بدیہی ہے، مثلاً یہ آگ ہے اور جو آگ ہے وہ جلاتی ہے، یہ استدلال محض لغو ہے کیونکہ انسان پہلے آگ کے خاص خاص افراد کے جلانے کا علم تجربہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے، پھر وہ کلیہ قائم کرتا ہے کہ ہر آگ جلاتی ہے، اِس بنا پر آگ کے ایک خاص فرد کے جلانے کا علم اس کو پہلے حاصل ہو چکا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اُس نے خود آگ کا تجربہ نہ کیا ہو بلکہ کسی سے سُنا ہو کہ آگ جلاتی ہے پھر اُس نے آگ کو دیکھا تو اِس صورت میں اسکا یہ استدلال صحیح ہوگا کہ یہ آگ ہے اور جو آگ ہے وُہ جلاتی ہے اسلیئے یہ جلاتی ہے لیکن یہ وہی صورت ہے کہ اسکو کبری کا علم تقلیداً حاصل ہُوا ہے اور اس صورت میں شکل اول کا مفید ہونا ہمنے خود تسلیم کیا ہے،

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر

کسی غیر قوم کا کسی غیر ملک پر قبضہ کرنا، کوئی جرم نہیں، ورنہ دُنیا کی سب سے بڑے فاتح سب سے بڑے مجرم ہوں گے، لیکن یہ دیکھنا چاہیئے کہ فاتح قوم نے ملک کی تہذیب و تمدن پر کیا اثر پیدا کیا۔ چنگیز خان فتوحات کے لحاظ سے دُنیا کا فاتح اعظم ہے لیکن اسکی داستان کا ایک ایک حرف خون سے رنگین ہے، مرہٹے ایک زمانے میں تمام ہندوستان پر چھاگئے لیکن اسطرح کہ آندھی کیطرح اُٹھے، لوٹا مارا، چوتھ وصول کی اور نکل گئے، بخلاف اس کے متمدن قوم جب کسی ملک پر قبضہ کرتی ہے تو وہاں کی تہذیب و تمدن دفعتہً بدل جاتی ہے، سفر کے وسائل، رہنے سہنے کا طور، کھانے پینے کے طریقے، وضع ولباس کا انداز، مکانوں کی سجاوٹ، گھروں کی صفائی، تجارت کے سامان، صنعت و حرفت کی حالت، ہر چیز پر ایک نیا عالم نظر آتا ہے، اور گو مفتوح قوم، ضد سے احسان نہ مانے لیکن در و دیوار سے شکر گزاری کی صدائیں آتی ہیں،

اِسی معیار سے ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ مسلمان جو ہندوستان میں آئے کس شان سے آئے اور ملک پر انکا کیا اثر ہوا لیکن اس مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے ہمکو بتانا چاہیئے کہ ہندوستان کی قدیم تہذیب و تمدن کی حالت کیا تھی، چونکہ ہم اس مضمون میں صرف تیموری حکومت کے دور سے بحث کرنی چاہتے ہیں اس لیئے اِسی زمانے سے پہلے کی حالت کا دکھانا کافی ہوگا!

اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ اس سے قبل کی اسلامی حکومتوں نے بھی ہندوستان کی تہذیب و تمدن کو کچھ نہ کچھ ضرور ترقی دی تھی تاہم بابر نے ترکستان سے آکر ہندوستان کو جس حالت میں دیکھا اُسکی تصویر اُسیکے لفظوں میں یہ ہے۔

اسپ خوب نے، گوشت خوب نے، انگور و خربزہ ہندوستان میں اچھے گھوڑے نہیں اچھا گوشت نہیں

ومیوه هائے خوب نے یخ وآب سرد نے، حمام و
مدرسہ نے، شمع ومشعل نے، شمع دان نے،
بجائے شمع ومشعل جمع کثیر چرکینے می باشند دیوٹی
میگویند در دست چپ خود سہ پایہ خوردی گرفتہ
اند کہ ازین سہ پایہ در کنار یک پایہ مثل سر شمعدان
یک آہنے را بہ چوب بہ ہمین سہ پایہ مضبوط کردہ اند
یک فتیلہ سستی را کہ برابر انگشت بودہ باشد
بہ چوب آہن دار پایہ دیگر بستہ اند در دست راست
ایشان یک کدوے ست کہ سوراخ آن را تنگ
گذاشتہ اند کہ روغن ازان جا باریک شدہ می ریزد،
بادشاہان و امرائے ایشان شب ہا اگر کاری
کہ احتیاج بہ شمع داشتہ باشند ہمین دیوٹ ہائے
چرکین این چراغ آوردہ نزدیک گرفتہ می ایستند۔
در باغ وعمارت ہا آب ہائے روان نے، در
عمارت او صفا و ہوا و اندام و سیاق نے
رعیت و مردم ریزہ تمام پائے برہنہ می گردند لنگوتہ
گفتہ یک چیزی می بندند، زنان آن خود یک لنگی
بستہ اند نصف آن را در کمر بستہ اند و نصف
دیگر را بر سر خود انداختہ اند (تزک بابری صفحہ ۲۰۴)

انگور نہین، خربزہ نہین، برف نہین، آب سرد نہین، حمام
نہین، مدرسہ نہین، شمع نہین، مشعل نہین، شمع دان نہین،
شمع کے بجائے دیوٹ ہوتا ہے، یہ تین پایہ کا ہوتا ہے
ایک پایہ میں چراغ دان کے مُنھ کے شکل کا ایک
لوہا لکڑی میں وصل کر کے لگا دیتے ہیں، ایک موٹی
بتی دوسرے پائے میں لگی ہوتی ہے داہنے
ہاتھ میں کدو کی ایک تونبی ہوتی ہے جس کا سوراخ
تنگ ہوتا ہے، اسیکی راہ سے تیل کی پتلی
سی دھار گرتی ہے، راجوں اور مہاراجوں
کو رات کے وقت روشنی کا جب کچھ کام
پڑتا ہے تو نوکر چاکر، یہی کثیف دیوٹ
لے کر اِن کے پاس کھڑے ہوتے
ہیں۔

باغوں اور عمارتوں میں، آب روان نہیں،
عمارتوں میں نہ صفائی ہے، نہ موزونی، نہ ہوا،
نہ تناسُب عام آدمی ننگے پانون ایک لنگوٹی
لگائے پھرتے ہیں، عورتیں لُنگی باندھتی ہیں،
جس کا آدھا حصہ کمر سے لپیٹ لیتی ہیں اور
آدھا سر پر ڈال لیتی ہیں،۔

(نوٹ صفحہ ۱۰۳) ظہیر الدین بابر نے اپنے حالات ترکی زبان میں لکھے تھے جو تزک بابری کے نام سے موسوم ہے عبد الرحیم
خانخانان نے اسکا فارسی میں ترجمہ کیا جو بمبئی میں چھپ گیا ہے، یہ عبارت فارسی ترجمہ کی ہے!

بابر کو قریباً چار سو برس ہوسئے لیکن آج بھی ہندوستان اُسکے بیان کی عینی شہادت دینے کو موجود ہے،

اب دیکھو، تیموریوں نے ہندوستان میں آکر تہذیب و تمدن کو کہاں سے کہاں پہونچادیا تہذیب و تمدن کی سیکڑون جزئیات ہیں، اِن میں سے مختصراً ہم بعض بعض کی تفصیل لکھتے ہیں۔

زمین کی پیداوار

ہندوستان اگرچہ، زراعتی ملک ہے اسلیئے نباتات اور ثمرات کی قسم سے تمام چیزیں یہاں پیدا ہونی چاہیئے تھیں، لیکن ہندو، چونکہ ملک سے کبھی نکلتے نہ تھے، اسلیئے ان کو دنیا کے ثمرات اور مزروعات کی خبر نہ تھی اسکے سوا، اُنکی قناعت پسند طبیعت کیلیئے، بڑھل، کٹھل اور پھوٹ کیا کم تھی، تیموریوں نے یہاں آنے کے ساتھ اس طرف توجہ کی، اور ایران و خراسان کے لطیف پھول اور پھل لاکر تمام ہندوستان میں پھیلا دیئے، قلم اور پیوند لگانے سے ہندو مطلقاً واقف نہ تھے سب سے پہلے اکبر کے زمانے میں محمد قلی افشار نے جو کشمیر میں داروغہ باغات تھا کابل سے شاہ آلو منگواکر، پیوند لگایا، اور پھر عام رواج ہوگیا تاہم اکبر کے زمانے تک آم کی قلم نہیں لگ سکتی تھی، خافی خان واقعات ۱۰۲۹ھ ہجری (صفحہ ۳۰۲) میں لکھتا ہے،

پیوند دادن اشجار میوہ دار در کشمیر و تمام ہندوستان نہ بود، محمد قلی افشار داروغہ باغات کشمیر در عہد عرش آشیانی اول نہال شاہ آلو از کابل طلبیدہ پیوند نمودہ بہ آب و ہوائے آن جا موافق آمد، ازان ایام رواج یافت و سال بسال در ہمہ بلاد ہندوستان ازین پیوند، میوہ ہائے شاداب و شیرین بالیدہ گردیدند، الا درخت انبہ را پیوند نتوانستند نمود،

اِسی زمانے میں اور بہت سے میوے، ولایت سے آئے انناس بھی اُسی زمانے مین یورپ سے آیا، جہانگیر تزک میں لکھتا ہے، (صفحہ ۳)

درایام دولت حضرت عرش آشیانی (یعنی اکبر) اکثر میوہ ہائے ولایت کہ در ہند نبود، بہم رسید اقسام انگور از صاحبی و حبشی و کشمشی در شہر ہائے مقرر شائع گشت، از جملہ میوہا میوہ

الیست کہ آں را اناناس می نامندو در بنادر فرنگ می شود در غایت خوشبوئی و راست مزہ گی است، در باغ گل افشان آگرہ ہر سال چندین ہزار بر می آید ۰ ۰ درختان سرو و صنوبر، و چنار، و سفیدار، و بید مولہ کہ ہرگز در ہندوستان خیال نکردہ بودند بہم رسیدہ و بسیار شدہ و درخت صندل کہ خاصہ جزائر بود در باغ نشو و نما یافتہ،،

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں صندل کے درخت عموماً باغوں میں ہوتے تھے حالانکہ آج اس ترقی کے زمانے میں بھی یہاں صندل کا نام و نشان نہیں، پستہ بھی آجکل ہندوستان میں بہاں پیدا نہیں ہوتا ہے لیکن اکبر کے زمانے میں پستہ کا درخت بویا گیا اور بار آور ہوا، آئین اکبری میں ہے :

ہمچناں تربز و شفتالو۔ و بادام و پستہ و انار و جز آں پیدا ئے گرفتہ،،

پھول، ہندوستان میں یُوں بھی کثرت سے تھے یہاں تک کہ جہانگیر جب کشمیر گیا تو اُستاد منصور کو جو شاہی مصور تھا حکم دیا کہ خاص کشمیر کے پھولوں کی تصویر کھینچے چنانچہ سو سے زیادہ پھولوں کی تصویریں لی گئیں، تزک میں جہانگیر خود لکھتا ہے :

انچہ " در العصری اُستاد منصور نقاش شبیہ کشیدہ از یک صد گل متجاوز است ،

لیکن تیموریوں کی خوش مذاقی نے اسپر قناعت نہ کی بلکہ ایران اور توران کے پھول منگوا ہندوستان کو ایران کا چمن زار بنا دیا، آئین اکبری میں ہے :

وگلہا ے ایرانی و تورانی از گل سُرخ و نرگس و بنفشہ، و یاسمن کبود و سوسن و ریحان و رعنا و زیبا و شقائق و تاج خروس و قلغہ و نافرمان و خطمی و جز آں بسیار شود،

ہندوستان کے گنوار مالی، باغ میں یوں ہی بے ترتیب درخت لگاتے تھے چمن بندی، خیابان، جدول، تختہ بندی کا کسی نے نام بھی نہیں سُنا تھا نہ باغوں میں کسی قسم کی عمارت اور آبشار ہوتے تھے بابر نے ہندوستان میں آکر ان چیزوں کو رواج دیا، ابوالفضل لکھتا ہے،

پیشتر دلبستان ہا در ہم می گشتند، از آن باز کہ قدوم فردوس مکانی (بابر) بے ترتیب،،

ہندوستان را فروغ افزود، خیابان بندی وطرح آرائی پدید آمد، عمارت ہای دلکشا و آبشار ہاے سامعہ افروز دیدہ وران آفاق را بہ شگفت آورد،

صنعت اور مصنوعات تیموریوں نے سیکڑوں قسم کی صنعتیں جاری کیں، جن سے یہاں کے اصلی باشندے ناواقف تھے، اِن سب کی تفصیل کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے، ہم صرف بعض کے نام اور مختصر کیفیت لکھتے ہیں،

پارچہ جات، ہندو ہمیشہ سے نہایت سادہ لباس پہنتے تھے، اور غالباً ان کو گزی گاڑھے کے سوا اور کچھ بُننا نہ آتا ہوگا، اکبر نے دلّی، لاہور، آگرہ، فتح پور، احمد آباد، گجرات میں پارچہ بافی کے بڑے بڑے کارخانے جاری کیے، اور ایران اور چین سے کاریگر بُلوا کر ہر قسم کے قیمتی کپڑے طیار کرائے، ابوالفضل لکھتا ہے،

از توجہ گیتی خداوند گوناگون قماش چہرہ برافروخت و ایرانی و فرنگی و خطائی فروان شد و اُستادان کارپرداز وہنرمندان نادرہ آئین آمدہ ہنگامہ آموزش گرم ساختند، در پیشگاہ حضور و شہر لاہور و فتح پور و احمد آباد و گجرات کارنامہا پدید آمد، بہ گوناگون تصویر نقش و گرہ و شگرف طرح ہا روائی گرفت، و عالم نوردان کار شناس بہ شگفت افتادند، و از قدردانی، نادرہ کاران زود یاب این مرز نیز آموختند،

ابوالفضل نے ان میں سے جن کپڑوں کے نام اور انکی قیمتیں لکھی ہیں، انمیں سے بعض کی تفصیل حسب ذیل ہے،

مخمل زربفت، فرنگی، گجراتی، کاشی، ہروی، طاس گجراتی، دارائی، مقیش، شردانی، مشجر فرنگی، دیبائے فرنگی، دیبائے یزدی، خارا، اطلس خطائی، نوار خطائی، خز، مخمل فرنگی خانی، سہ رنگ، قطنی، برآن فرنگی، تافتہ، انبری، مطبق،

یہ سب ریشمی کپڑوں کے نام ہیں، سوتی کپڑوں کی تفصیل حسب ذیل ہے،

چوتار، ململ، نین سکھ، سری صافت، گنگا جل، بھیرون، سالور، بہادر شاہی،

گریہ سوتی، اشیلہ دکنی، مہرکل، سہن، جھونہ، اساولی، محمودی، پنجتو لیہ، اجولہ، چھینٹ وغیرہ وغیرہ،

شال جو کشمیر میں بنتی تھی اکبر نے اسکو بھی بہت ترقی دی، پہلے صرف تین چار رنگ کی شالیں ہوتی تھیں، اکبر نے طرح طرح کے نئے رنگ ایجاد کیئے مثلاً نارنجی، برنجی، قرمزی، کاہی، ارغوانی، عنابی، عسلی، سوسنی، جگری، زمردی وغیرہ وغیرہ، پوری تفصیل آئین اکبری میں ہے، اسکے علاوہ پہلے سادی شال بنتی تھی، اکبر نے اور بہت سی قسمیں ایجاد کیں، ابوالفضل لکھتا ہے

ونیز زردوزی، وکلابتون، وکشیدہ، وقلغہ، وباندھنون، وچھینٹ، والچہ، وپرزدار، از فروغ خاطر والاست،

پہلے شال کا کارخانہ صرف کشمیر میں تھا، اکبر کے زمانے میں خاص لاہور میں ہزار سے زیادہ کارخانے جاری ہو گئے،

بندوبست اراضی اور پیمائش

ہندوؤں کے زمانے میں تشخیص مالگذاری کا صرف یہ طریقہ تھا کہ ہل پیچھے کچھ رقم مقرر کر دیتے تھے، زمین کی پیمائش اور مختلف لیاقتوں کے لحاظ جمع کی تشخیص نہیں جانتے تھے، خافی خاں لکھتا ہے،

مخفی نماند کہ ولایت پُر وسعت شش صوبہ دکن، از قدیم، ملک بود زرخیز سیر حاصل کہ دستور تشخیص جمع مال برسر بیگہ وشمار دپیمودن زمین برجریب وتقسیم غلہ نمودہ گرفتن درمیان نبود، چنان مقرر بود کہ ہر یکے از دہاقین ومزارعان کہ بر یک قلبہ ویک جفت گاؤ آنچہ می توانست، کشت کاری نمود وہر جنسے از حبوبات وبقولات کہ می خواست می کاشت بر سر قلبہ، قلیلے بہ اختلاف بلاد و پرگنات وسر کاری داد، باز پرس کمیت بہم رسیدن غلہ وغیرہ درمیان نمی آمد،

خافی خاں نے دکن کے ذکر کی خصوصیت کی وجہ سے دکن کا نام لیا، ورنہ کل

(خافی خاں صفحہ ۷۳۲)

ہندوستان کا یہی حال تھا، سب سے پہلے اکبر کے عہد ۹۷۲؁ھ جلوس شاہی میں راجہ ٹوڈرمل نے زمین کی پیمائش کرائی، اسکے مختلف درجے قائم کیے، اور اختلاف درجات کے لحاظ سے مختلف شرحیں مقرر کیں لیکن دکن میں اب تک وہی قدیم طریقہ جاری تھا، شاہجہاں کے عہد میں مرشد علی خاں نے جو دکن کا صوبہ دار تھا حسب ذیل انتظامات کیے[۱]

(۱) زمین کی پیمائش کرائی،

(۲) قابل زراعت، اور ناقابل زراعت کی تفریق کی،

(۳) تقاوی دینے کا قاعدہ جاری کیا،

(۴) تشخیص جمع کے متعدد طریقے مقرر کیے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) بٹائی، اس میں زمین کی تین قسمیں کیں، بارانی اس میں نصف بٹائی مقرر کی یعنے جس قدر غلہ پیدا ہو، اس میں آدھا، سرکاری حق ہے،

چاہی، یعنے وہ زمین جو آب پاشی کے ذریعہ سے کام میں لائی جائے، اس میں صرف ایک تہائی سرکار کا حق تھا، ایکھ، انگور، کیلہ، پوست، زیرہ، اسپغول، ان چیزوں میں نویں حصے سے لیکر چہارم تک سرکاری مالگذاری میں داخل ہوتا تھا،

نہری، یعنے وہ زمین جس میں نہروں سے آب پاشی کی جاتی تھی،

(۲) جریب، اس طریقہ میں فی بیگہ، چوتھائی پیداوار لی جاتی تھی،

شاید ایک نکتہ چین بول اُٹھے کہ زمین کا بندوبست وغیرہ جو کچھ کیا تھا، ٹوڈرمل نے کیا تھا جو ہندو تھا لیکن یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں، ہر سلطنت میں دوسری قوموں سے بھی کام لیا جاتا تھا لیکن وہ سلطنت ہی کے کارناموں میں محسوب ہوتا ہے، اسکے علاوہ یہ بات بھی لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ ٹوڈرمل کے اکثر کاموں میں امیر فتح اللہ شیرازی کی شرکت تھی جسکے فضل و کمال کا تمام ہندوستان اور ایران میں جواب نہ تھا، ابوالفضل

[۱] خافی خاں (صفحہ ۷۳۲ و ۷۳۳) میں یہ تفصیل ہے، میں نے اُسی کا ترجمہ کردیا ہے،

اسکی نسبت کہا کرتا تھا کہ "اگر کہن نامہ ہائے دانش مفقود شوند اواساس نو برنہد"

سنہ ۳۰ جلوس اکبری میں وہ امین الملک مقرر ہوا اور حکم ہوا کہ ٹوڈرمل اُسکے مشورہ سے مُلکی اور مالی کاموں کو انجام دے، چنانچہ مآثر الامرا میں ہے،

حکم شد کہ راجہ ٹوڈرمل، مہمات ملکی و مالی بہ صواب دید امیر روبراہ کند، و کہن معاملہا کہ اززمان مظفرخان تشخیص نیافتہ بہ انجام رساند امیر فضلی چند کہ متضمن کفایت سرکار ورفاہ رعایا بود برگذارد، پذیرفتہ شد (صفحہ ۱۰ جلد اول)

افزائش ترقی حیوانات کسی ملک کے تمدن کی ترقی کا ایک بڑا لازمہ یہ ہے کہ غیر ملک کے حیوانات کی نسلیں اضافہ کیجائیں، مُلکی جانوروں کے نسلونکی ترقی و تربیت، اور وسعت کا انتظام کیا جائے، تیموریوں نے اِس صیغہ کو بے انتہا ترقی دی،

اونٹ اِس ملک میں بالکل نہیں ہوتے تھے، ضرورت کیلیے باہر سے منگوائے جاتے تھے، اور اس وجہ سے ہر شخص کو میسر نہیں آسکتے تھے اکبر نے اسکے لیئے ایک خاص محکمہ قائم کیا اور چند روز میں نہایت عمدہ نسلیں طیار ہو گئیں، ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے،

دبہ شاہی خواہش را چنان نتاج برگرفتند کہ از عراقی بختیان برگذشت

(صفحہ ۶ جلد سوم مطبوعہ نولکشور)

اجمیر، جودھپور، ناگور، بیکانیر، جیسلمیر، بھنڈا میں کثرت سے نسلیں پھیلیں، ابوالفضل نے لکھا ہے، کہ ایک ایک شخص کے پاس دس دس ہزار اونٹ تک ہوتے تھے،

ہندوستان کے اصلی گھوڑے پست قد ہوتے تھے جنکو اس زمانے میں گوٹ یا ٹانگن کہتے تھے، اکبر کے زمانے میں، سوداگر عراق، عرب روم، ترکستان، بدخشان، تبت وغیرہ سے گھوڑے لاتے تھے، لیکن اکبر نے نئی نسلوں کے پیدا کرنے کا انتظام کیا، اور نہایت اعلیٰ درجے کے گھوڑوں کی نسلیں طیار ہوئیں جہانگیر تزک میں لکھتا ہے،

پیش از عہد دولت حضرت عرش آشیانی (یعنے اکبر) مدار سواری مردم این جا بر گونٹ بود، اسپ کلان نمی داشتند مگر از خارج اسپ عراقی و ترکی رسم تحفہ جہت حکام آوردندے گونٹ عبارت از یابوئی ست چہار شانہ بزمین نزدیک در سایہ کوہستان ہند فراوان می باشد، بعد ازان کہ این گلشن خدا آفرین بہ تائید دولت و یمن تربیت خاقان سکندر آئین، رونق جاوید یافت، بسیارے از ایاقات را درین صوبہ جاگیر مرحمت فرمودہ گلہ ہائے اسپ عراقی و ترکی حوالہ شد کہ کرۂ (بچھیرے) بگیرند، در اندک فرصت اسپان بہم رسیدہ (صفحہ ۳۰۱)

ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے،

کارشناسان دیدہ در در نتائج این ہوش پذیر آدمی خود دل بستند، در اندک فرصتے ہندوستان باجستان عرب آمد و بسیارے از عربی و عراقی جدا نتوانند کرد،

(جلد اول صفحہ ۹۴)

اسکے بعد گھوڑوں کی خرید و فروخت اور ترقی اور نمائش کے لیئے **اکبر** نے جو انتظامات کیئے تھے اُسکو ابوالفضل نے بہ تفصیل لکھا ہے،

خچر صرف **پکھلی** کے علاقہ میں ہوتے تھے لیکن سواری کے قابل نہیں ہوتے تھے اور لوگ اسکی سواری کو گدھے کی طرح ننگ سمجھتے تھے **اکبر** نے اسکی نسل کو اسقدر ترقی دی کہ ہزار روپیہ تک اسکی قیمت پہونچی اور لوگوں کو اسکی سواری سے عار نہ رہا[1]۔

اکثر جانور ایسے ہیں جو جنگل کے سوا بچے نہیں جنتے مثلاً ہاتی، شیر، چیتے، چکور، سارس وغیرہ لیکن تربیت کے ذریعے سے اسقدر اُنکے اخلاق اور عادات میں تغیر پیدا کیا گیا، کہ گھروں میں ان سے بچے اور انڈے پیدا ہوئے، اکبر کے ایک زمانے میں ہزار چیتونکو یکجا کیا اور چاہا کہ زیادہ سے جفت ہو، لیکن ناکامیابی ہوئی، **جہانگیر** کے عہد میں اسقدر

[1] آئین اکبری جلد اول صفحہ ۱۰۴

تغیر ہوا کہ ہاتی اور چیتے، مادہ سے جفت ہوئے اور بچے جنے، جہانگیر تزک میں لکھتا ہے،

یوز مقررست کہ در غیر جاہائے کہ می باشد بہ مادہ خود جفت نمی شود چنانچہ والد بزرگوارم

یک مدتے تا ہزار یوز جمع کردہ بودند بسیار خواہان آن بودند کہ آن ہا بایک دگر جفت شوند

اصلا نمی شد و بارہا یوزہائے نر و مادہ در باغات قلادہ برآوردہ سر دادند در انجا ہم نشد

درین ایام یوز نرے قلادہ خود را گسیختہ بر سر مادہ یوزے میرود و جفت می شود، بعد از دو

نیم ماہ سہ بچہ زائیدہ و کلان شدہ،

جہانگیر نے فخریہ لکھا ہے کہ میرے زمانے میں صحرائی جانور اسقدر رام ہو گئے ہیں کہ شیر اور چیتے قطار در قطار، بے قید و زنجیر شہر میں چھوٹے پھرتے ہیں اور کسی کو نہیں ستاتے ہتنی، شیرنی، چکور سے بچہ جننے اور انڈے دینے کا حال، جہانگیر نے تزک میں لکھا ہے،

جہانگیر نے ایک عظیم الشان جانور خانہ طیار کرایا تھا، اسکو حیوانات کا اسقدر شوق تھا کہ اپنے ایجنٹوں کو دور دراز مقامات پر نئے نئے جانوروں کے مہیا کرنے کیلیے بھیجتا تھا، ایک دفعہ مقرب خاں کو گووا بھیجا کہ وہاں سے یورپ وغیرہ کے نادر جانور خرید کرکے لائے مقرب خاں بیشمار روپیہ خرچ کرکے بہت سے عجیب و غریب جانور لایا، انھیں میں پیرو بھی تھا جس کو انگریزی مرغی کہتے ہیں، چنانچہ اس واقعہ کو جہانگیر نے نہایت تفصیل سے لکھا ہے، اسکا اقتباس یہ ہے،

حسب الحکم بہ استعداد تمام بہ گووا رفت و مدتے دران جا بودہ نفایسے کہ دران

بندر بدست افتاد اصلا روئے زر ندید، بہ ہر قیمتے کہ فرنگیان خواستند زر دادہ گرفت،

از ہر جنس چیزہا و تحفہا داشت ازان جملہ جانورے چند آوردہ بود بسیار عجیب و غریب

چنانچہ تا حال ندیدہ بودم بلکہ نام او را کسے نمی دانست،

جہانگیر نے ان تمام جانوروں کی تصویریں بھی کھچوائیں چنانچہ تفصیل اسکی آگے آئے گی، ان میں سے ایک جانور کا حال ان لفظوں میں لکھا ہے،

میموسے آوردہ بود بہ ہیأت غریب × دست و پا گوش و سرا و بعینہ میمون ست و بینی و بروے روباہ می ماند، رنگ چشمہاے او برنگ چشم باز لیکن چشم او از چشم باز کلاں ترست، از سر او تا سرِ دُم یک درع سمعول بودہ است، از میمون پست تر، و از روباہ بلند ترست، پشم او بطریق پشم گوسفند و رنگ آن خاکستری ست، از بنا گوش تا زنخ سُرخ ست می گون × دگاہے آواز سے از و ظاہر مے شود بطریق آواز آہو برہ، مجملا جیرے غرائب دارد،

جانوروں کی پرورش، پرداخت، تربیت، علاج وغیرہ سے متعلق اسقدر سامان فراہم کیے گئے تھے کہ انکی تفصیل اس مضمون میں نہیں آسکتی، آئین اکبری اور تزک جہانگیری دیکھنی چاہیئے،

سنہ ۱۰۲۳ ہجری میں ولایت زیر باد سے ایک عجیب وغریب پرند، چڑیا خانہ میں داخل ہوا، جسکی کیفیت جہانگیر نے ان الفاظوں میں لکھی ہے،

یکے از خصوصیات این جانور آن ست کہ تمام شب پاسے خود را بعصر شاخ درختے یا چوبی کہ او را بران نشانیدہ باشند بند کردہ خود را سر شیب (اُلٹا) می سازد و با خود زمزمہ می کند، × آب مطلق نمی خورد و در طبیعت او کار زہری کند، با آن کہ بقائے حیوانات بر آب ست[1]۔

رفاہ عام کے کام عمارات اور سڑک وغیرہ	اس محکمہ کو تیموریوں سے بے انتہا ترقی دی، لیکن انصاف یہ ہے کہ اسکا سنگ بُنیاد شیر شاہ نے رکھا تھا، تیموری اسکے مقلد تھے

شیر شاہ نے بنگالہ سے آگرہ، ماندو، اور سونپت تک راستہ میں مسجدیں، پختہ کنوئیں اور سرائیں بنوائیں اور حکم دیا کہ ہندو اور مسلمان سب کے لیے سراؤں میں کھانا مہیا ہے، سڑکوں کے دونوں طرف سایہ دار درخت لگائے، چنانچہ خافی خاں اس واقعہ کو ان الفاظ میں لکھتا ہے

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۱۳۳،

مابین راه بنگاله تا اکبرآباد و اندو دسنپت، که مسافت بعیدست برای مسافران مسجد و چاه پخته ساخته، و در مساجد موذن و جاروب کش بمدد وظیفه مقرر نموده، و در سراها طعام پخته و خام برای مسافرین و مترددین مسلمین و هنود قرار داده جهت پختن آن غلامان و نوکران نگاه داشته بود، گویند آتش نژادان سراهای هند که به بھٹیاره و بھٹیاری زبان زد مردم هند گردیده اند از اولاد همان ها مانده اند، و مقرر نمودن اسپان سرکار در سراها برای زود رسیدن اخبار مختلفه روزگار به دربار بطریق ڈاک از اختراع اوست، و مابین راهها اشجار میوه دار و درختان سایه دار برای آرام مسافران نشانده،[1]

جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے پہلے ہی سال اس محکمہ کی طرف توجہ کی، چنانچہ احکام دوازدہ گانہ میں سے دوسرا حکم یہ تھا کہ راستوں میں مسجدیں، کنوئیں، اور سرائیں طیار کیجائیں اسکے ساتھ یہ حکم دیا کہ جو شخص لاوارث مرے اسکی متروکہ سے مسجدیں اور سرائیں، کنوئیں اور تالاب تعمیر کیے جائیں اور پلوں کی مرمت کرائی جائے انھیں احکام دوازدہ گانہ میں یہ بھی تھا کہ تمام بڑے بڑے شہروں میں اسپتال بنائے جائیں جن میں سرکاری طبیب علاج کے لیے مقرر ہوں، اور دوا وغیرہ کا صرف سرکار سے دیا جائے،[2]

سال اول جلوس ہی میں جہانگیر نے حکم دیا کہ تمام شہروں میں غلہ خانے قائم کیے جائیں جہاں راہگیروں اور مسافروں کو کھانا تقسیم کیا جائے چنانچہ تزک میں لکھتا ہے،

در تمام ممالک محروسہ خواہ در محال خالصہ و خواہ جاگیردار حکم فرمودم کہ غلور خانہا ترتیب دادہ بجہت فقرا فراخور گنجائش آن محل، طعام درویشانہ طبخ می نمودہ باشند تا مجاوران و مسافران بہ فیض رسند،[3]

سنہ ۱۰۲۰ ہجری میں اس صیغہ کو اور وسعت دی یعنی عام طور پر فقرا کیلئے لنگر خانے بنوائے، چنانچہ تزک میں لکھتا ہے

---

[1] خافی خان جلد اول صفحہ ۱۳۰ و منتخبات سنہ ۹۵۲ ہجری، [2] تزک جہانگیری صفحہ ۳، [3] تزک جہانگیری صفحہ ۳۵،

هفدهم ذی قعده حکم کردم که در شهرهای کلانِ ممالک محروسه مثل احمد آباد و الٰه آباد و لاهور و آگره و دهلی وغیره غلورخانه به جهت فقرا ترتیب دهند،

سنہ ۱۰۲۸ ہجری میں اِس پر اور اضافہ کیا، چنانچہ اسکی تفصیل خافی خاں اِن الفاظ میں لکھتا ہے۔

درہمین سال کہ مراد از سنہ ہزار و بست و ہشت باشد حکم فرمودند کہ ما بین راہ از لاہور تا تعلقہ سرحد مالوا، بہ فاصلہ یک کروہ جریبی یک میل و ما بین دو میل یک چاہ بسازند و ہمہ جادہ رستہ درختان سایہ دار نشانند وبہ زمینداران و حکام، احکام ترتیب اشجار صادر فرمودند ہر جا محال خالصہ یعنی شاہی جاگیر، برای ساختن سرا حکم نمودند و بامرا حکم فرمودند کہ در تعلقہ محال جاگیر خود ہر مکانی کہ قابل سرا ساختن باشد برای نزول مسافرین و مترددین سرای پختہ و مسجد و چاہ بسازند، و اکثر جاگیرداران بموجب امر بادشاہ و ہم چشمی یک دیگر بنای خیر احداث سراہا تا ہر چہار پنج کروہ گذاشتند،

غور کرو، ایک ایک کوس پر دو دو میل اسکے بیچ میں ایک ایک کنواں چار چار میل کے بیچ میں سرائیں، بنوانا کسقدر مصارف کثیر کا کام ہے اور جس ملک میں یہ اہتمام ہو وہاں سفر کرنا کسقدر آسان ہوگا،

جہانگیر نے سڑک پر جو میل بنوائے تھے، وہ بڑے بڑے چوڑے مینار کی شکل کے تھے اور آج بھی پنجاب کی راہ میں موجود ہیں، اور ریل پر سے نظر آتے ہیں،

راستے کی امن و امان، اور سفر کی آسانی کا یہ نتیجہ تھا کہ ایران، اور بغداد اور شام کی چیزیں ہندوستان کے بازاروں میں اِس کثرت سے ملتی تھیں کہ خود اُن ملکوں میں نہیں مل سکتی تھیں، دیرپا چیزیں ایک طرف پھل اور میوے تین تین مہینے کے راستہ سے تازہ بتازہ پہونچتے تھے، جہانگیر نے ایک موقع پر خود اِس انتظام پر اس استعجاب کے ساتھ خدا کا شکر

سلہ خافی خاں صفحہ ۲۹۸؛

کیا ہے، سالہ جلوس میں جب اسکے دسترخوان پر مختلف ملکوں سے تازہ میوے ایک ساتھ چنے گئے تو اسکو بھی حیرت ہوئی اور بول اٹھا کہ اس نعمت کا شکر کس زبان سے ادا کیا جائے، چنانچہ لکھتا ہے،

در یک خوان چندین قسم میوہ حاضر آوردند خربزہ کاریز و خربزہ بدخشان و کابل و انگور سمرقند، و بدخشان، و سیب سمرقند، و کشمیر، و جلال آباد و انناس کہ از میوہ ہائی بنادر فرنگ است، و کوله کہ در شکل و اندام خورد تر از نارنج است، و در صوبہ بنگالہ خوب می شود شکر این نعمت بکدام زبان ادا تواند نمود (صفحہ ۱۷۳)

یہ نہیں خیال کرنا چاہیئے کہ یہ انتظام بادشاہوں کے لیے مخصوص تھا بلکہ ہر کس و ناکس کو یہ چیزیں بازار میں میسر آسکتی تھیں، آئین اکبری میں تفصیل سے لکھا ہے کہ کہاں کہاں سے میوہ جات آتے تھے اور تمام بازاروں میں بکتے تھے،

آج اس وسعت، اس انتظام، اس ترقی کے زمانے میں، ہمکو بلوچستان اور کابل سے اُدھر کے میوے نصیب نہیں ہو سکتے،

راستوں کے انتظام اور ڈاک کے بیان میں یہ بات بھی لکھنے کے قابل ہے کہ معمولی طریقے کے علاوہ نامہ بر کبوتر بھی طیار کیے گئے اور ان سے کام لیا گیا، چنانچہ جہانگیر تزک میں لکھتا ہے،

بہ کبوتر بازان فرمودم کہ این بار آموختہ کنند و این کبوتر بازان چند جفتے را چنان آموختہ کردند کہ در اول روز کہ از ماندو پرواز آنہا می نمودیم اگر کثرت باران بسیار می شد نہایتش تا دو نیم پہر بلکہ تا یک و نیم پہر بہ برہانپور می رسیدند و اگر ہوا بغایت صاف می بود اکثرے در یک پہر می رسیدند (صفحہ ۱۹۱)

ایجادات و اختراعات

تمدن کی ترقی کا ایک ضروری نتیجہ ایجادات اور اختراعات ہیں، تیموریوں کے زمانے میں ہر شاخ میں طرح طرح کی چیزیں ایجاد ہوئیں، ان میں سے جو علمی

ایجادات تھے، انمیں سے بعض کا حال ہم لکھتے ہیں،

ایک عجیب و غریب حوض یہ حوض، فن عمارت کی ایسی بوالعجبی تھی جسکی نظیر آج بھی مشکل سے ملیگی، اسکا موجد حکیم علی تھا جو اکبر کے دربار کا مشہور حکیم اور موجد تھا، یہ حوض حکیم موصوف نے سنہ ۳۵ جلوس اکبری میں بنایا تھا جسکی یہ کیفیت تھی کہ حوض کے اندر ایک مختصر سا کمرہ تھا جسمیں دس بارہ آدمی بیٹھ سکتے تھے کمرہ میں ہر طرف سے روشنی آتی تھی لیکن ہوا کا رُخ اسطرح قائم کیا تھا کہ پانی نہیں آسکتا تھا، کمرہ فرش و فروش سے آراستہ رہتا تھا کھانا بھی طیار ملتا تھا، ماٰثر الامرا میں اسکا حال اور اکبر کے سیر کرنیکی کیفیت حسب ذیل لکھی ہے،

در کُنج حوض سربے بہ آب فرد بردہ دو سہ زینہ پائین رفتہ بدان خانہ در آمد بسیار بہ تکلف آراستہ، درغایت روشنی، جائے دہ دوازدہ کس ست فرش خواب درخت پوشش مہیا و حاضری طعام موجود، چند جلد کتاب در طاق ہا گذاشتہ، ہوائی گذاشت کہ یک قطرۂ آب اندرون درآید و چون بادشاہ لختے درنگ فرمود غریب حالتے بر مردم بیرون روآورد[۱]

سنہ ۱۰۱۸ ہجری میں جہانگیر نے اسکی سیر کی چنانچہ تزک میں اسکا حال لکھتا ہے،

حوض مذکور شش گز در شش گز ست، و در پہلوے حوض خانہ ساختہ شدہ بغایت روشنی کہ راہ بہ آن خانہ ہم از درون آب ست و آب ازان راہ درون در نمی آید دہ دوازدہ کس دران خانہ صحبت می داشتند[۲]،

کل کی چکی یہ چکی امیر فتح اللہ شیرازی نے ایجاد کی تھی جو سنہ ۹۹۱ ہجری میں اکبر کے حسب الحکم فتح پور میں آیا، اور امین الملک کے عہدہ پر ممتاز ہوا تھا، یہ چکی پانی اور ہوا وغیرہ کے ذریعے نہیں بلکہ خود بخود چلتی تھی ماٰثر الامرا میں لکھا ہے،

آسیائے ساختہ کہ خود حرکت می کرد، وآرد می ساخت[۳]،

آج تو یہ ایجاد ایک معمولی بات ہے لیکن اُس زمانے میں یورپ میں بھی عجیب سمجھی

---

[۱] ماٰثر الامرا جلد اول صفحہ ۵۷۰، [۲] تزک جہانگیری صفحہ ۷۲، [۳] ماٰثر الامرا جلد اول صفحہ ۱۰۴،

جاتی ہوگی،

توپ کی مختلف قسمیں اکبر کے صناعوں نے مختلف طرح کی توپیں ایجاد کیں، انہیں سے ایک سترہ نال کی تھی، اور ایک ہی دفعہ سب نالیں سر ہوتی تھیں، ایک ایسی تھی کہ چونکہ سے حلقہ کیطرح الگ الگ ہوجاتی تھی، اور ضرورت کے وقت حلقے ملا دیتے تو ایک توپ بن جاتی تھی، چنانچہ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے د

گوناگون اختراع فرمود وجہانے بہ شگفت زار افتاد، یکے برشے کار آوردند پورشہا از ہم جدا کردہ بہ آسانی برند، ونیز ہفدہ را چنان یکتائی داد کہ یک فتیلہ ہمہ کشاد دہد ونیز چنان برساخت کہ یک فیل بہ آسانی کشد وآن را گج نال نامند،

گوے آتشین اکبر کبھی کبھی راتوں کو گیند کھیلتا تھا، اسلیے اس قسم کے گیند ایجاد کیے کہ رات کو مشعلہ کی طرح روشن نظر آئیں،

اس قسم کی بہت سی ایجادیں ہوئیں جنکی تفصیل ایک مضمون میں سما نہیں سکتی،

نفاست پسندی ضروریات کی وسعت، آسائش کے سامان تمدن کا سب سے مقدم اثر یہ ہوتا ہے کہ ضروریات معاشرت بڑھتے جاتے ہیں مثلاً سادہ زندگی یہ ہے کہ زمین پر بیٹھے اور کیلے کے پتہ پر کھانا رکھکر کھالیا، تمدن آتا ہے تو یہ سامان ساتھ لاتا ہے کہ چاندنی کا فرش ہے، اسپر زیر انداز، زیرانداز پر طشت یا سیلابچی، آدمی نے آفتابہ ہات میں لیکر ہات دھلواے، پھر دسترخوان بچھایا گیا، رنگ برنگ کے مختلف برتنوں میں کھانے آئے کھانوں کی مناسبت سے ہر ہر برتن کا رنگ، اور صورت شکل مختلف ہی، کھانا کھا چکے، تو طشت، سیلابچی آفتابہ وغیرہ آیا، اب کی ہات دھونے کیلیے بیسن بھی ہی، ہات دھو کر رومال سے صاف کیا، یہ تو قدیم تہذیب تھی، نئے فیشن نے اسپر اور بھی حنے نئے حاشیے چڑھاے،

ہندوستان میں مسلمان آئے تو یا وہ حالت تھی جسکی تصویر بابر نے کھینچی ہو کہ لنگوٹی

لگائے پھرتے تھے، یا مسلمانوں نے ایک ایک چیز میں تہذیب و تمدن کی ہزاروں شاخیں پیدا کر دیں، مثلاً پہلے گھوڑوں پر ننگی پیٹھ سوار ہوتے تھے، یا کمل وغیرہ ڈال لیتے تھے، تیموریوں کے عہد میں گھوڑے کے لیئے جو سامان پیدا ہوئے انکی یہ تفصیل ہے،

زین،

ارتک،

یال پوشش،

پشمین روپاک،

جل،

تختہ بند،

پشت تنگ،

گمس ران،

تکتہ،

قیزہ،

دست مال،

خرخرہ،

رکاب،

آئین اکبری میں ان سب کی تصویریں بھی دی ہیں،

گھوڑوں کی تربیت خدمت اور نگہداشت کے لیے جن نوکروں کی ضرورت ہوتی تھی انکی تفصیل یہ ہے،

داروغہ[1]، مشرف[2]، دیدہ ور[3]، چابک سوار[4]، ھاڈا[5]، مرہم[6]، نیطلہ[7]، نقیب[8]، سائیس[9]،

جلودار[10]، نعلبند[11]، زین دار[12]، آب کش[13]، فراش[14]، سپند سوز[15]، خاک روب[16]،

آئین اکبری میں ان سب کے کام اور ان کے مشاہرے بہ تفصیل لکھے ہیں،
لنگوٹہ اور دھوتی کے بجائے کپڑوں کے یہ اقسام پیدا ہوئے،

دوتاہی، پیشواز، شاہ آجیدہ، سوزنی، قلمی، قبا، فرجی، فرغل، اچکن، شلوار،

جامہ، کلاہ، صدری، قمیص، جبا، نیم تنہ، شلوکہ، کمربند،

ان میں آج بہت سے متروک ہیں،

زنانہ لباس اور زیور اور آرائش کے متعلق نورجہاں بیگم نے جو اختراعات کیئے، تہذیب و تمدن قیامت تک اُسکے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، ہندوؤں کا کیا ذکر ہے مسلمانوں میں بھی نورجہاں سے پہلے زیورات بھدے اور ناموزوں ہوتے تھے جیسے آجکل ہندوؤں کے ہوتے ہیں، لباس اور وضع قطع میں بھی نازک ادائیاں نہ تھیں، آج دلّی اور لکھنؤ کی بیگمات کے لباس اور وضع کی تمام تراش خراش سب نورجہاں کے عہد کی یادگاریں ہیں، جنمیں خفیف تغیرات ہوتے گئے خود جہانگیر کہا کرتا تھا کہ جب تک نورجہاں میرے گھر میں نہیں آئی میں گھر کی زیب و زینت سے واقف نہوا، مآثر الامراء میں ہے،۔

اکثر زیور، و لباس و اسباب تزئین و تقطیع کہ معمول ہندست مخترعاتی و ابداعی اوست، مثل دودامنی جہت پیشواز، و پنچ تولیہ، جہت اوڑھنی، بادلہ و کناری و عطر گلاب۔ و فرش چاندنی ہمہ وضع اوست[1]،،

خافی خان کہتا ہے،

اقسام زیور و لباس زنان ہند کہ در محل بادشاہی، و اُمرائے مغلیہ تا حال رواج دارد ہمہ وضع کردۂ اوست۔ و زیور و پیرایۂ سابق کہ بسیار کلفت و بدنما بود منسوخ ساخت چاندنی کہ نفس الامر عجب فرش عیب پوش خانہ نامراد و گرد پوش فرش دولتمندان ست

---

[1] تزک جہانگیری جلد اول صفحہ ۱۳،

و در شبہای مہتاب نمود خاص دارد، وضع کردہ ہمان ست واقسام جنس بادلہ کر قسم سنگین آنرا بنام بادشاہ وکارخانہ موسوم ساخت وجنس سبک کرازان تمام خلعت عروس و داماد مردم نامراد بہ پانزدہ وبست روپیہ تمام شود۔ و دیگر تصرفہائے بجای اوکہ برائے اور بہ برائے شاہ وگدا بہ کار آید زیادہ ازان ست کہ بہ تفصیل ان توان پرداخت، (صفحہ ۲۶۹)

آسایش اور آرام اور راحت کے جو ہزارون سامان پیدا ہوئے اُنکا شمار نہین کیا جا سکتا ہندوستان میں قدرتی تمام اشیاء پیدا ہوتی تھیں لیکن لوگونکو اُن سے کام لینا نہیں آتا تھا مسلمانوں کی خوش مذاقی اور جدت طلبی سے ہزارون چیزین کام میں آئیں اور ایک نئی دُنیا پیدا ہو گئی۔ شورہ خاص یہان کی پیداوار ہے، لیکن کسی کو ہزاروں برس تک یہ خیال نہ آیا کہ اِس سے پانی ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے، حالانکہ ٹھنڈے پانی کی ضرورت جس قدر ایسے گرم ملک میں ہو سکتی تھی محتاج بیان نہین، برف بھی پہاڑوں سے آسکتی تھی، لیکن یہاں کے لوگوں کو اپنی وحشیانہ زندگی میں آب سرد کی ضرورت کیا تھی، لیکن مسلمان عجم سے آئے تو وہ ایسی زندگی کیونکر بسر کر سکتے تھے اکبر نے شورہ سے پانی سرد کرنے کو رواج دیا، پہاڑوں سے برف آکر بازاروں میں بکنے لگی خس کی ٹٹی بھی اکبر ہی کی ایجاد ہے، ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے،

بہ شورہ سرد کردن روائے گرفت، واز شمالی کوہ برف و یخ آوردن کرومہ دانست، ایخے ست بویا وبس خنک، آن را خس گویند بہ فرمائش گیتی خدیو ازان ہنے بست خانہا ساختن رواج یافت۔ (صفحہ ۶، جلد ۳)

عمارت فن عمارت میں جو نفاستین اور ایجادین پیدا ہوئین انکا بیان تاج گنج اور جامع مسجد دہلی کی زبان سے ہر شخص سُن سکتا ہے، ہندؤن کے مکانات کی جو اصلی وضع تھی، اسکی زندہ مثالیں بنارس میں آج ہزارون موجود ہیں، یہ مکانات کر در تیلوں کے ہیں جن پر لاکھوں روپے

خرچ ہوئے ہیں، لیکن دروازے اتنے اونچے ہیں کہ سرکش سے سرکش آدمی کو انکے آگے سر جھکانا پڑتا ہے، ہوا کو تو کبھی کبھی اِن میں آنے کی اجازت ملجاتی ہے لیکن روشنی کو مشکل سے بار ملسکتا ہے، بلند دروازے، وسیع دالان، شاندار شہ نشین مسلمانوں کی بدولت ملک میں رواج پائے،

ہمایوں نامہ

از

گلبدن بیگم

ایک طرف تو ہمارے مولوی مسلمانوں کے کافر بنانے میں مصروف ہیں اور اس کام میں وہ کوشش کرتے ہیں، جو صحابہ کافروں کے مسلمان بنانے میں کرتے تھے، دوسری طرف یورپ کی علمی فیاضیوں کا بادل عالم پر آب حیات برسا رہا ہے۔ دُنیا کی تمام قوموں کے مردہ علوم، فنون، تاریخ اور یادگاریں زمین کے طبقے اُلٹ اُلٹ کر نکالے جا رہے ہیں اور دُنیا کی نمائش گاہ اِن گم شدہ جواہرات سے اِسطرح سجادی گئی ہے کہ گویا پچھلا زمانہ اُسی سرو سامان سے دوبارہ سامنے آگیا ہے۔

اِن علمی کوششوں میں نہ صرف مردوں کا گروہ مصروف ہے بلکہ طبقہ اُناث بھی جو ہمارے ملک میں صرف ایوان عیش کی سجانے کی تصویریں ہیں، اُسی ہمت، جوش اور استقلال سے مشغول ہے جو ازل سے آجتک مردوں کا خاصہ سمجھا جاتا تھا،

مدت ہوئی جب میں علیگڈہ کالج میں پروفیسر تھا، ایک صاحب پرنسپل نے مجھ سے کہا کہ گلبدن بیگم کا ہمایون نامہ کہاں ملیگا؟ لنڈن سے ایک خاتون نے اسکا پتہ پوچھا ہے،

مجھ کو اپنی تاریخ دانی پر ناز تھا، میرے غرور توڑنے کیلیے یہ کچھ کم بات نہ تھی کہ میں ہمایون نامہ

ایکطرف سرے سے گلبدن بیگم کو نہیں جانتا تھا، میں نے ہندوستان کے کتب خانوں کو خطوط لکھے کہیں سے جواب نہ آیا! لیکن اب یہی نایاب چیز، عام ہوکر بازار دنیں آگئی گلبدن بیگم بابر کی بیٹی، ہمایون کی بہن، اور شہنشاہ اکبر کی پھوپھی تھی، اسنے بابر اور ہمایوں کے حالات میں ایک کتاب لکھی اور ہمایون نامہ نام رکھا۔

ہمایون نامہ چونکہ ایک خاتون کی تصنیف تھی۔ یورپ کی خوش مذاقی نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے ایک خاتون ہی کو انتخاب کیا، یعنی لیڈی اینٹ ایس بیورج کو اس کتاب کے بہم پہونچانے کا خیال ہوا، لیڈی موصوف نے اس کتاب کی تلاش میں بے انتہا جان فشانیاں کیں، اس سلسلہ میں یہ بات بیان کرنے کے قابل ہی کہ لیڈی صاحبہ نے شوق جستجو میں اُردو تصنیفات پر بھی نظر ڈالی، اور چونکہ وہ نا اُمید ہوچکی تھیں اسلیئے جب انکو مولوی محمد حسین صاحب آزاد کی دربار اکبری میں گلبدن بیگم کا نام ملا تو انکی اُمیدیں دوبارہ تازہ ہوگئیں، اُنھوں نے بمبئی میں اپنے ایک دوست کو خط لکھا کہ مولویصاحب موصوف سے ملکر، ہمایون نامہ کا پتہ لگائیں، لیکن مولوی محمد حسین آزاد سے ملکر انکو معلوم ہوا کہ آزاد نے جو کچھ لکھا تھا وہ خود لیڈی صاحبہ کی خوشہ چینی تھی، یعنی اُس آرٹکل سے ماخوذ تھا جو لیڈی صاحبہ اس سے پہلے ایک انگریزی پرچہ میں گلبدن بیگم کے متعلق لکھ چکی تھیں مصرعہ

آن کس کہ گفت قصہ ما ہم ز ما شنید

بہرحال لیڈی صاحبہ کی تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا یہانتک کہ اُنھوں نے اس نایاب کتاب کے متعدد نسخے بہم پہونچائے اور نہ صرف کتاب کو چھاپا بلکہ حسب ذیل باتیں اضافہ کیں،

۱۔ گلبدن بیگم کی نہایت مفصل سوانح عمری لکھی،

۲۔ کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا،

۳۔ ترکی الفاظ نہایت کثرت سے تھے اُنکی تحقیق کی، اور ان کو حل کیا،

۴۔ کتاب میں سیکڑوں شاہی خاندان کی بیگمات کے نام آگئے تھے اُن سب کے حالات لکھے

۵۔ جسقدر نام کتاب میں آئے ہیں اُنکی مفصل فہرست شامل کی کہ جس شخص کے متعلق کچھ دیکھنا چاہیں فوراً اُسکا پتہ لگ جائے۔

یہ کتاب سنہ ۱۹۰۲ء میں چھپکر بہ مقام لندن شائع ہوئی اور نو دلعہ قیمت پر بمبئی میں ٹھیکر کی دکان سے مل سکتی ہے،

اَب ہم اصل کتاب پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں۔

سب سے پہلے ہمکو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ گلبدن بیگم کا زمانہ وہ زمانہ ہی جب تیموری سلطنت کی بُنیاد قائم ہو رہی تھی، ایسے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی یہ حالت تھی کہ بیگمات ایسی تصنیفیں کرتی تھیں، جو آج مردوں سے بن نہیں سکتیں، فارسی زبان میں سادہ اور صاف واقعہ نگاری کا عمدہ سے عمدہ نمونہ، تزک جہانگیری، اور رقعات عالمگیری ہیں، اور اسمیں شبہہ نہیں کہ یہ کتابیں سادگی اور لطافت کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ ہزاروں ظہوری، اور وقائع نعمت خان انپر نثار کر دی جائیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ ہمایوں نامہ کچھ انسے بھی آگے بڑھا ہوا ہی، اسکے چھوٹے چھوٹے فقرے سادہ اور بے تکلف الفاظ، روزمرہ، عام بول چال، طرز ادا کی بیساختگی، دلکو بے اختیار کر دیتی ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

بابر نے ایک چھوٹے بچے کو ایک اشرفی بھیجی تھی کہ سوراخ کرکے اُسکے گلے میں پہنا دینا لیکن پہلے اسکی آنکھیں بند کر دینا کہ دیکھنے نہ پائے، بچہ نے گو دیکھا نہیں، لیکن اشرفی کو ہاتھ سے ٹٹولتا ہے اور خوش ہو ہو کر اُچھلتا ہے، ساتھ ہی دونوں ہاتھوں سے اشرفی کو مٹھی میں دبائے ہوئے ہی کہ کوئی چھین نہ لے، اِس واقعہ کو یُوں ادا کیا ہے۔

حکم بود کہ اشرفی را سوراخ کردہ چشمش رابستہ درگردنش اندا ختہ، درون حرم فرستید، مجبور سے کہ اشرفی سوراخ کردہ در گردنش انداختند، از گرانی، طرفہ بے طاقتی و اضطراب و خوشحالی میکرد، وبہ دو دست اشرفی را گرفتہ طرفگیہا

میکردکر کسے اسشمر فی مزاگیرد،

ایک اور موقع۔

حضرت بادشاہ فرمودند کہ آکہ جانم (بیگم کا خطاب ہے) اگر حکم شود در حوض آب بمانند، آکہ جانم گفتند، بسیار خوب، خود آمدہ بر سر زینہ نشستند و مردم غافل کہ یکبارگی شراس زدہ (زور سے) آب آمد، جوانان را طرفہ اضطرابے دست داد، حضرت بادشاہ فرمودند دخلے ندارد، (کچھ مضائقہ نہیں)

حمیدہ بانو بیگم (اکبر شاہ کی ماں) سے جب ہمایون نے شادی کرنی چاہی تو وہ راضی نہیں ہوتی تھی، ایک مہینہ سے زیادہ جھگڑا رہا، بالآخر بڑی مشکلوں سے راضی ہوئی، اِس واقعہ کو یوں ادا کیا ہے۔

غرضکہ تا چہل روز از جہت حمیدہ بانو بیگم مبالغہ و مناقشہ بود، بیگم راضی نشدند، آخر حضرت والدہ ام دلدار بیگم نصیحت کردند کہ آخر خود بہ کسے خواہی رسید، بہتر از بادشاہ کہ خواہد بود؟ بیگم گفتند کہ آرے بہ کسے خواہم رسید کہ دست من بگریبان او برسد نہ آنکہ بہ کسے برسم کہ دست من میدانم بہ دامن او نرسد،

اس آزادی اور بلند حوصلگی کو دیکھو، ایک بادشاہ ذوی الاقتدار، شادی کرنا چاہتا ہے حمیدہ بانو نہیں مانتی، اور جب شاہ بیگم نے کہا کہ آخر کسی کے پلے تو بندھیگی تو کہتی ہو کہ ہاں اُس سے بندھونگی جسکے گریبان تک میرا ہاتھ پہونچے، نہ اُس سے کہ میرا ہاتھ اُس کے دامن تک بھی نہ پہونچے۔

قدیم تصنیفات میں روزمرہ اور محاورے بہت کم ملتے ہیں جسکی وجہ یہ ہو کہ ارباب قلم نے تصنیفی زبان علیحدہ قرار دے لی تھی، اسمیں عام بول چال اور روزمرہ کا لانا خلاف متانت سمجھتے تھے، یہی وجہ ہو کہ آج سے تین سو برس پہلے کی عام زبان نہیں معلوم ہو سکتی جسقدر کتابیں موجود ہیں، سب میں وہی مصنوعی اور ساختہ زبان مستعمل ہو لیکن ہمایون نامہ

میں کثرت سے ایسے محاورے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ نمونے درج ہیں۔

ایستادہ دریافتم	کھڑے کھڑے ملا۔
پیشواز آمدند،	استقبال کو آئے،
قلعگی شد،	محاصرہ ہوا۔
طرفگیہا میگرد	شوخیاں کرتا تھا۔
بیائید تا یکدیگر مرا دریابیم	آؤ گلے لگیں
ہندال مرزا چہ مقدار شدہ است	ہندال مرزا اب کتنا بڑا ہوا (یعنی کتنا قد ہے)
پائے میداد	
جان درازی	طول عمر
آب را تنگ نمیکردند۔	پانی بند نہیں کرتے تھے۔
خفتن شد	سونے کا وقت آیا
نماز دیگرے بود	عصر کی نماز کا وقت تھا۔
مرا بہ شمشیر گرفتند	تلواریں لیکر مجھ پر آپڑے
سروپا	لباس
سر حضرت شوم	آپ پر قربان ہوں۔
روستائے گری	گنوارپن
ساعتے معطل کردند	ذرا دیر توقف کیا
اسپش اندک بلند رفت	اُسکا گھوڑا ذرا اونچا اُڑا۔

تاریخی مذاق ہمکو سب سے پہلے اِس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ شاہی خاندان کی نازپروردہ خاتون تاریخ نویسی کے فرض اور ذمہ داری سے کسقدر واقف ہے، اسنے یہ کتاب اپنی مرضی سے نہیں لکھی اور شاید لکھنا پسند نکرتی لیکن اکبر اعظم کی فرمایش ٹالی نہیں جاسکتی تھی اسنے تعمیل

حکم کی، تاہم فرائض تاریخ نویسی کے لحاظ سے سب سے پہلے یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھی۔

وقتیکہ حضرت فردوس مکانی (بابر بادشاہ) از دار الفنا بہ دار البقا خرامید ند

این حقیر ہشت سالہ بود، دریانِ واقع شاید کمتر ک بہ خاطر ماندہ بود، بنا بر حکم بادشاہی

(اکبر شاہ) انچہ شنیدہ و بہ خاطر بود نوشتہ میشود)

یہ خاص عرب مورخین کا مذاق ہے کہ روایت کا سلسلہ اخیر تک پہونچا دیتے ہیں۔ گلبدن کی عمر بابر کی وفات کے وقت صرف آٹھ برس کی تھی، اسلیے اسنے صاف اسکا اظہار کیا اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بھی بہ تصریح کہدیا کہ اس عمر کے واقعات کم یاد رہتے ہیں، ساتھ ہی مجبوری بھی ظاہر کی کہ بادشاہ کا حکم تھا، آگے چلکر ہمایون کے واقعات میں بھی جو واقعہ خود اسکی آنکھوں کے سامنے نہیں گزرا اُسکے متعلق لکھدیتی ہے کہ میں نے فلان شخص سے سُنا ہے۔

ایشیائی مورخین کی عادت ہے کہ وہ تاریخی واقعات میں سے صرف جنگ و جدل، بغاوت اور خونریزیوں کے واقعات کو لیتے ہیں، اور اُنکو خوب پھیلاتے ہیں؛ اسلیئے یورپ والے ہماری تاریخوں کو قصائی کی دوکان کہتے ہیں، اور واقعی ان تاریخوں سے اُس عہد کے تمدن، شائستگی، پالٹیکس، معاشرت، خانگی زندگی، کا پتہ لگانا چاہیں تو بہت کم کامیابی ہوتی ہے، گلبدن بیگم، یا تو اس نکتہ سے واقف تھی، یا اس لیئے کہ عورت تھی اور لڑائی بھڑائی کی باتوں میں اُسکو لطف نہ آتا ہوگا، بہر حال وجہ کچھ ہو لیکن کتاب اس مذاق میں لکھی ہے کہ اس عہد کی معاشرت اور زندگی کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے کسی شادی یا جلسہ کی تقریب کا حال لکھتی ہے تو من وعن تصویر کھینچدیتی ہے۔ مثلاً میرزا ہندال کی شادی کے ذکر میں لکھتی ہے۔

مردم دیگر کہ بدست چپ بادشاہ نشستہ بودند بر توشک زردوزی معصومہ سلطان بیگم و گلرنگ بیگم (اور بہت سے بیگمات کے نام گنائے ہیں) دطرح خانہ طلسم بدین تفصیل خانہ کلان مثمن کہ دران جا طوی (جلسہ) دادند خورد دیگر برابر آن ہم مثمن بود، تختہ مرصع نہادہ

در بالا و پایان تخت او شقہاے زر دوزی انداختہ و شدہاے مروارید آویختہ بہ مقدار
یک نیم گز درازی. ہر لڑے دو گرہ آئینہ در پایان، در شمن خورد چھپر کھٹ مرصع نہادہ پاندان
و صراحی و مشربہ و گلاس مرصع، دران خانہ نہ اسباب سپہ گری بود مثل شمشیر مرصع، قور
مرصع کمر خنجر مرصع، و جمدھر و کھپوہ مرصع و ترکش (شادی میں بھی ہتھیار ساتھ ہیں) و خانہ
دوم کہ آن را خانہ سعادت می گفتند در آن خانہ جاے نماز، و کتاب، و قلمدانہاے
مرصع، و جزدانہاے خوش، و مرقعہاے لطیف، مع تصویر ہاے و خطہاے
خوش نہادہ بودند، در لب حوض تالارے (دگرہ) بود و در تالار دریچہ ہا رنگ گرفتہ بودند
کہ جوانان دران تالار نشستہ و بازی گران بازی می کردند بازار زنانہ نیز کردہ بودند (اکبر
کے مینا بازار کی یہی بنیاد ہے) و کشتی ہا آئین بستہ بودند۔ و در کشتی بالاخانہ بود و
پایان باغے ساختہ بودند از قسم قلعہ و تاج خروس و نافرمان و لالہ کاشتہ بودند۔

اِس کتاب سے اِس زمانہ کی تہذیب و معاشرت کے جو حالات معلوم ہوتے ہیں، اُنمیں
سے بعض قابل ذکر ہیں۔

عورتیں لکھنے پڑھنے کے علاوہ فنون سپہگری سے خوب واقف ہوتی تھیں
اور سفر اور سیر و شکار میں عموماً گھوڑے پر سوار ہوتی تھیں، یہانتک کہ بعض عورتیں مردانہ لباس
پہنتی تھیں۔ مہر انگیز بیگم کے حال میں لکھا ہے۔

لباس مردانہ می پوشیدند و بہ انواع ہنر آراستہ ہمچو زہگیر تراشی و چوگان بازی
تیر اندازی و اکثر سازہا و باجے ہا می نواختند۔

ایک موقع پر لکھا ہے۔

ماہ چوچک بیگم نادانستہ اندک بلند رفت

ہمایون جب ایران گیا ہے تو حمیدہ بیگم (اکبر کی ماں) بھی ساتھ تھی اور محافہ میں سفر کرتی
تھی، لیکن ہمایون کی بہن ہمیشہ گھوڑے پر سوار، بادشاہ کے عقب میں چلتی تھی،

یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عورتیں موسیقی میں بھی کمال رکھتی تھیں اور خاندان کے آدمی جب ایک جگہ ملکر بیٹھتے تھے تو عورتیں خود بھی گانے میں شریک ہوتی تھیں لیکن یہ احتیاط رہتی تھی کہ اُسوقت کوئی بیگانہ آدمی نہیں ہوتا تھا۔

۲۔ عورتوں کا نہایت احترام کیا جاتا تھا، بابر کی بیوی جسکا نام ماہم بیگم تھا جب کابل سے ہندوستان میں آئی ہے تو بابر دو کوس تک پا پیادہ استقبال کو گیا، اور جب بیگم کی سواری سامنے آئی، اور اُسنے بابر کو پیادہ دیکھکر، سواری سے اُترنا چاہا تو بابر نے نہ مانا اور سواری کے ساتھ ساتھ پیدل، مکان تک آیا، ان دلچسپ واقعات کو گلبدن بیگم ان الفاظ میں لکھتی ہے۔

حضرت بادشاہ (بابر) خیال داشتند کہ تا کول جلالی پیشواز در استقبال، روند، نماز شام یکے آمدہ گفت کہ حضرت (ماہم بیگم) را در دو گروہی گزاشتہ آمدہ ام، حضرت بادشاہ بابام (بابر) تا اسپ آوردن تحمل نکردند و پیادہ روان شدند، و در پیش خانہ نخچہ ماہم در خوردند، آکام (یعنی ماہم بیگم) می خواستند کہ پیادہ شوند بادشاہ بابام نماندند و خود در جلوی آکام تا خانہ خود پیادہ آمدند۔

مُلکی معاملات میں عورتوں سے مشورہ اور رائے لیجاتی تھی اور ہر قسم کے اُمور میں انکی شرکت ضروری سمجھتے تھے۔

۳۔ آج یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوگی کہ اُسوقت عورتوں کو اپنی شادی اور نکاح کے معاملہ میں پوری آزادی حاصل تھی، ہمایوں نے جب حمیدہ بانو بیگم سے شادی کرنی چاہی تو اُسنے صاف انکار کیا، اور مدت تک اپنے ارادہ اور ضد پر قائم رہی اور جب معزز بیگمات نے کہا کہ آخر کسی سے شادی کرنا ہی ہے، بادشاہ سے کیوں احتراز ہے تو حمیدہ نے کہا کہ میں اُس سے شادی کرونگی جس سے برابری کا دعویٰ ہو سکے، بادشاہ کا اور میرا جوڑ کیا،

۴۔ لیکن ہمارے زمانہ کے پردہ شکن گروہ کو یہ سُنکر مایوسی ہوگی کہ ان سب باتوں کے ساتھ

حاشیہ آکا۔ ماں کو کہتے ہیں یم متکلم کی ہے یعنی میری ماں، اسی طرح بابا میں متکلم کی میم لگا کر بابام کردیا ہے یعنی میرے والد۔

عورتیں نامحرم سے پردہ کرتی تھیں اور بغیر نقاب اور برقع کے باہر نہیں نکلتی تھیں ہمایوں نے نکاح سے پہلے جب حمیدہ بانو بیگم کو بلایا ہے تو اُسنے کہا کہ آداب سلطنت کے لحاظ سے ایک دفعہ مین بادشاہ سے سلام کو جا چکی ہوں۔ دو بارہ جانا نامحرم کے سامنے جانا ہی، چنانچہ خود حمیدہ بانو کے یہ الفاظ ہیں۔

دو دیدن بادشاہان یک مرتبہ جائز است در مرتبۂ دیگر نامحرم است من نمی آیم۔

چنانچہ جب تک شادی نہیں ہوئی کبھی ہمایوں کے سامنے نہیں آئی،

۵۔ ایشیائی سلطنتوںمین بادشاہ نہ صرف تخت پر بلکہ خانگی زندگی میں بھی بادشاہ ہوتا ہے، بادشاہ کا خردسال پیارا بچہ بھی جب اسکے سامنے جاتا ہے تو پیار سے باپ کی گود میں نہین بلکہ ایک شاہنشاہ کے دربار میں جاتا ہے، یہ بادشاہ پرستی اور شخص پرستی کی اخیر حد ہے اور قومی زندگی کی یہ آخری علامت ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں یہ حالت نہ تھی، بابر اور ہمایوں اسطرح اپنے عزیز، قریب اور بھائی بہنوں سے ملتے تھے جسطرح ایک عام آدمی اپنے پیارے عزیزون سے ملتا ہے۔ گلبدن بیگم اس قسم کے واقعات کو نہایت دلچسپی سے لکھتی ہے اور ان موقعوں پر اسکے قلم سے محبت کا آب حیات ٹپکتا ہے۔ ہمایون جب بیمار ہوا ہے اور اسکی بہنیں اُسکی عیادت کو آئی ہیں اس موقع پر لکھتی ہے۔

این حقیر ہمراہ ہمشیرہا ملازمت آن حضرت فرشتہ خصال، رفتہ کردم × ہرگاہ کہ آن حضرت بہوش خویش می آمدند از زبان دُرافشان خویش پرسش میفرمودند کہ خواہران! خوش آمدید، بیائید تا یکدیگر را دریابیم کہ شمارا در نیافتہ ایم۔

ایک اور موقع پر ہمایون گلبدن بیگم سے کہتا ہے۔

این حقیر را دیدند فرمودند کہ اول ترا نشناختم از برای آنکہ وقتیکہ لشکر ظفر اثر بہ گور بنگالہ کشیدہ بودم، طاقی پوش بودی، الحال لچک قصابہ دیدم نشناختم گلبدن! من

ترا بسیار یاد می کردم (گاہے پشیمان شدہ می گفتم کہ کاشکے ہمراہ مے آوردم)

بابر اپنے چھوٹے بیٹے ہندال کا حال ایک شخص سے پوچھتا ہے،

ہندال کجا است؟ کے خواہد آمد؟ چہ بلا انتظار داد * ہندال مرزا چہ مقدار شدہ است؟ و بہ کہ مانند است؟

چون میر بردی بیگ جامہ میرزا پوشیدہ بود، نمود کہ این جامہ شاہزادہ است کہ بر بندہ عنایت فرمودہ اند، حضرت (بابر) پیشتر طلبیدند کہ ببینم قد و قامت ہندال چہ مقدار شدہ است؟

ہندال سے گلبدن کو بھی نہایت محبت تھی، جب وہ لڑائی میں مارا گیا تو گلبدن کو سخت صدمہ ہوا، اس موقع پر لکھتی ہے۔

نمی دانم کدام ظالمے بے رحمے آن جوان کم آزار را بہ تیغ ظلم بے جان کردہ،

کاشکے بہ دل و دیدہ من، یا بہ سعادت یار پسر من، یا بہ حضرت خواجہ خان (گلبدن کے شوہر کا نام ہے) آن تیغ بیدریغ می رسید،

دیکھو بھتیجہ، بیٹے اور شوہر سے بھی زیادہ عزیز ہے!

اگرچہ ہمنے گلبدن بیگم کی کتاب سے وہی حالات انتخاب کیے ہیں جنسے اُس زمانہ کی معاشرت اور خانگی زندگی کا پتہ لگتا ہے لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ بیگم ملکی در سیاسی واقعات کو قلم انداز کرتی ہے، اسنے ہمایوں کے ایک ایک واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے، اور اسمیں بھی وہ اور مورخین سے ممتاز نظر آتی ہے، وہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ کس واقعہ کو سمیٹ کر اور کس واقعہ کو پھیلا کر لکھنا چاہیئے، وہ خوب جانتی ہے کہ کونسا واقعہ کیا اثر رکھتا ہے، اور اسلیے اُسکے اسباب و علل سے کہانتک بحث کرنی چاہیئے

مثلاً ہمایون نے اپنے بھائی مرزا کامران کی بار بار خونریزی اور بدعہدی سے تنگ آکر اسکو اندھا کرا دیا تھا، لیکن ہمایون اسقدر نرم دل اور رحم جسم تھا کہ یہ حرکت

اس سے بہت بعید معلوم ہوتی ہے۔ با این ہمہ بدایونی، اور فیاضی خان نے اس واقعہ سے متعلق صرف اسقدر لکھا کہ ہمایون کے حکم سے اُسکی آنکھیں اندھی کردی گئیں، لیکن بیگم اِس واقعہ کو تفصیل سے لکھتی ہے جس سے واقعہ کی اصلیت ذہن نشین ہوجاتی ہے چنانچہ اسکے الفاظ یہ ہیں۔

عاقبة الامر جمیع خانان وسلاطین ووضیع وشریف وصغیر وکبیر وسپاہی ورعیت وغیرہ کہ از دست میرزا کامران داغہا داشتند دران مجلس متفق شدہ بہ عرض حضرت بادشاہ رسانیدند کہ در بادشاہی وحکم رسم برادری منظور نمی باشد، اگر خاطر برادر میخواہید ترک بادشاہی بکنید واگر بادشاہی می خواہید ترک برادری بکنید × × ×

حضرت بادشاہ درجواب فرمودند کہ اگرچہ این سخنان شمایان خاطر نشان می کنید اما دل من نمی شود، ہمہ فریاد برآوردند وگفتند کہ انچہ بہ عرض رسانیدہ شدہ است عین مصلحت است۔ آخر الامر حضرت فرمودند کہ اگر مصلحت ورضامندی ہمہ شمایان درین ست پس ہمہ شمایان جمع شوید ومحضرے نولیسید ہمہ ازیمین ویسار امرایان جمع شدہ نوشتہ دادند ہمان مصرع راح رخنہ گر ملک سر افگندہ بہ، بہ حضرت بادشاہ ہم ضرور شد،

افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ کتاب میں سیکڑوں ہزاروں الفاظ ترکی کے ہیں، اور زیادہ تر وہی ہیں جو سامان، اسباب خانہ داری ظروف وطعام، سامان سفر، وضع لباس وغیرہ کے متعلق ہیں، ہم انکو سمجھ نہیں سکتے، ورنہ سوشل لائف کی پوری تصویر اس سے تیار ہوسکتی تھی۔

اخیر میں ہمکو دوبارہ اِس معزز انگریزی خاتون کی علمی شوق کی داد دینی چاہیئے جسنے اِس نایاب کتاب کے بہم پہونچانے اور تصحیح وتحشیہ میں وہ قابلیت اور محنت صرف کی، جو ہماری قوم کے مردوں سے بھی بن نہیں آتی۔

مآثر رحیمی

اور

عبد الرحیم خان خانان

اسلاف کی تصنیفات کا ذخیرہ نُچا کھُچا جو کچھ رہگیا ہے، اسکی بنا پر ہم ایک رائے قائم کرتے ہیں، اسکو بار بار تحریر و تقریر میں دُہراتے ہیں، سلسلہ بہ سلسلہ اسکی روایتیں چلتی ہیں، رفتہ رفتہ وہ ایک مسلمہ واقعہ بن جاتا ہے اور لوگوں کے دل و دماغ میں سرایت کرجاتا ہے، اتفاقاً کہیں سے کوئی سڑی گلی کتاب، یا کسی کتاب کے کچھ بوسیدہ اجزا ہاتھ آجاتے ہیں جس سے دفعتہً وہ تمام خیالات بدل جاتے ہیں، اور ایک نئی تھیوری قائم ہوجاتی ہی۔

پروفیسر سیدیو نے جو فرانس کا بہت بڑا مشہور عربی دان فاضل گذرا ہی، اپنی کتاب تاریخ عرب میں لکھا ہے کہ "اہل یورپ نے بہت چیزوں سے متعلق یہ رائے قائم کرلی تھی کہ وہ حال کی ایجادات سے ہیں لیکن عربی نایاب کتابوں کے بہم پہونچنے نے ثابت کیا کہ ان کا خیال غلط تھا، آج سے پہلے اہل عرب نے اُن چیزوں کے اختراع کی عزت حاصل کی تھی"، پروفیسر مذکور نے اِس بنا پر فضلائے یورپ سے خط کتابت اور ایک خاص سوسائٹی اس غرض سے قائم کی کہ عرب کے گم شدہ اسرار کا پتہ لگایا جائے، چنانچہ یہ تمام خط کتابت اسنے کتاب مذکور میں درج کی ہے پروفیسر موصوف کا خیال، اسکے ساتھ گیا، اور کہیں سے کچھ صدا نہیں اُٹھی، پچھلے دنوں یورپ میں جو اورنٹیل کانفرنس قائم ہوئی تھی، اسمیں یہ رزولیوشن پاس ہوا کہ ایک خاص کمیٹی اسلام کی انسائیکلوپیڈیا طیار کرنے کیلئے قائم کیجائے جسمیں مسلمانوں کے تمام علوم و فنون، صنائع، ایجادات وغیرہ وغیرہ درج کیے

ہو ائیں، ہمارے محترم اُستاد مسٹر ارنلڈ بھی اِس کمیٹی کے ممبر ہیں، لیکن پھر ہمکو کوئی اطلاع نہیں ملی کہ کمیٹی نے اب تک کیا کیا کیا!

یہ ظاہر ہے کہ یہ کام یورپ کے فرائض میں داخل نہیں تاہم اسوقت تک یورپ نے ہماری یادگاروں کو زندہ کرنے میں، اور جو کام کیے وہ کیا کم ہیں، انھیں کی بدولت فنِ حرب کی وہ کتاب شائع ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے اِس فن کے علمی اُصول مرتب کیے تھے اور اُنکا فنِ جنگ، موجودہ فن جنگ کا مکمل خاکہ تھا، یورپ ہی کی بدولت زہراوی کی کتاب، فن تشریح کے متعلق چھپکر شائع ہوئی جسمیں کئی سو آلات تشریح کی تصویریں اور ان کے استعمال کے طریقے درج کیے ہیں، پیٹ میں مرے ہوئے بچے کے نکالنے کے بیسیوں آلات، کے نقشے دیکر، اِن کے استعمال کے طریقے بتائے ہیں، یورپ ہی کی بدولت، تاریخ طبری، طبقات ابن سعد، اور تاریخ الحکما وغیرہ کا پتہ لگا جو گویا دُنیا سے ناپید ہو گئی تھیں۔

اسلام آج دُنیا کے تمام حصوں میں پھیلا ہوا ہے، کروروں مسلمان موجود ہیں، بڑی بڑی حکومتیں اور سلطنتیں قائم ہیں، عربی علوم و فنون اُسی زور شور کے ساتھ پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں، اس بنا پر دُنیا کو ہمسے اِس کام کی توقع تھی، لیکن ابھی ہمکو اور ضروری کاموں سے فرصت کہاں ہے، حمداللہ کے بعض ضروری مقامات ابتک ناحل شدہ ہیں، شرح مُلّا کی ایک ضمیر کا مرجع ابتک متعین نہیں ہوا، میر زاہد کی بعدیت زمانی اور مکانی کا ابتک فیصلہ نہیں ہو چکا اور خیر، یہ سب کام تو اُٹھا بھی رکھے جا سکتے ہیں، لیکن شیعوں کی تکفیر تو بہرحال مقدم ہے، اور گو وہابیوں کا استیصال اُس قدر ضروری نہو، لیکن آخر اسکی اہمیت سے تو انکار نہیں ہو سکتا۔

افسوس ہے ہمدردِ دل نے ایک چھوٹی سی تمہید کو کسقدر لنبا اور خارج از بحث کردیا لیکن کیا کیا جائے۔

عاشق مست و شب افسانہ دیار، وہر بار		قدرے گرید، و پس بر سر افسانہ رود،

کہنا یہ تھا کہ اب بھی بہت سی علمی یادگاریں ایسی موجود ہیں، جن سے مسلمانون کی تصنیفات کے متعلق جو رائے قائم ہو چکی ہے دفعتہً بدلجاتی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ فارسی مورخوں نے سلاطین اور روسا کے حالات قلمبند کیے ہیں، وزرا، امرا، سپہ سالار اور فوجی افسروں کے حالات مستقل تصنیفوں میں اس طرح نہیں لکھے جس سے ظاہر ہو کہ انھوں نے کس طرح تعلیم وتربیت پائی، کیا کیا فن حاصل کیے، کیا کیا کارنامے دکھائے، رفاہ عام کے کیا کیا کام کیے، کن کن چیزوں کو رواج دیا۔ کون کون سی باتیں ایجاد کیں، ذاتی شوق کی کیا کیا چیزیں تھیں وغیرہ وغیرہ، لیکن دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء میں، جب میں کلکتہ گیا تو ایشیاٹک سوسائٹی میں مآثر رحیمی کا ایک نسخہ نظر سے گذرا، یہ کتاب، **عبدالرحیم خان خانان** کے حالات میں ہے، جو اکبر شاہ کا سپہ سالار تھا۔ مصنف کا نام عبدالباقی ہے جو ایران کا باشندہ اور ایک معزز خاندان کا ممبر تھا، کتاب خود خان خانان کی زندگی میں لکھی گئی ہے اور سرمایہ معلومات زیادہ تر ذاتی مشاہدہ، اور سرکاری کاغذات ہیں، یہ نسخہ مصنف کا اصلی مسودہ ہے جو کسی کاتب سے لکھوایا ہے، لیکن الحاقات اور اضافے مصنف نے اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں، بعض جگہ سادے صفحے چھوڑ دیے ہیں اور لکھا ہے کہ مزید اطلاع کیلیے صفحے خالی چھوڑ دیے گئے تھے لیکن چونکہ حالات نہ مل سکے اسلیے جگہ سادی کی سادی رہ گئی، سرورق پر امرائے شاہی کی مہریں ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اکثر امرا کے کتب خانوں میں رہ چکا ہے، مولوی غلام علی آزاد نے خزانہ عامرہ میں لکھا ہے کہ "میں نے اس کتاب کا اصلی مسودہ دکن میں دیکھا تھا جس پر الحاقات خود مصنف کے ہاتھ کے ہیں" غالباً یہ وہی نسخہ ہے، جو دکن سے کلکتہ پہونچ گیا۔

کتاب کی ضخامت، دو ہزار صفحوں کی ہے۔ نصف کے قریب، خانخانان کے اسلاف، اور سلاطین تیموری کے حالات ہیں، باقی نصف، خود خانخانان کے کارنامے

ہیں، جسمیں حسب ذیل عنوانات ہیں،

(۱) خان خانان کی ولادت اور تعلیم و تربیت، تعلیم کا حال تفصیل سے لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے کاملین فن سے تعلیم پائی تھی،

(۲) دربار شاہی سے تعلقات اور فتوحات،

(۳) خان خانان کی علمی لیاقت، عربی فارسی، ترکی میں، انشا پردازی اور شاعری نثر اور نظم دونوں کے نمونے درج کیے ہیں،

(۴) فضائل اخلاق،

(۵) فن سپہگری، اور تیغ بازی و نیزہ بازی کے کمالات،

(۶) خان خانان کے رفاہ عام کے کام،

(۷) فن زراعت کی ترقی۔

(۸) خان خانان کے دربار کے صناعوں اور کاریگروں کا ذکر اور انکے حالات ایجادات

(۹) خان خانان کا کتب خانہ۔

(۱۰) خان خانان کے دربار کے شعرا،

(۱۱) علما، اطبا اور خوشنویس،

اتنی بڑی ضخیم کتاب کا مختصر سے مختصر خلاصہ بھی اگر کیا جائے تو اچھا خاصہ رسالہ بنجائیگا، اسکے علاوہ اُردو زبان کے مشہور جادو طراز، مولوی محمد حسین آزاد نے دربار اکبری میں خان خانان کا تذکرہ دل کھول کر لکھا ہے، اور بہت سی کتابوں کو کھنگالا ہے، گو یہ کتاب انکو ہاتھ نہیں آئی ہے، ان وجوہ سے ہم نہایت اختصار کے ساتھ کتاب مذکور کے کچھ مقتبسات اس غرض سے درج کرتے ہیں، کہ ہمارے ملک کے ارباب دولت، اسکی طبع و اشاعت کیطرف متوجہ ہوں، ہماری نگاہیں خلیفہ سید محمد حسین صاحب وزیر پٹیالہ، نواب علی حسن خانصاحب بھوپال، نواب مزمل اللہ خانصاحب بھیکن پور،

اور حبیب صادق مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی کی طرف بلند ہیں۔

خان خانان کی فتوحات، اور معرکہ ہائے جنگ، دراصل مرقع اکبری کے نقش و نگار ہیں، اسلیے اُن کو چھوڑ کر اور قسم کے واقعات اور حالات کو لیتے ہیں،

شاعری اور انشاپردازی

خان خانان مختلف زبانوں میں کمال رکھتا تھا مصنف نے اسکی عربی، فارسی، ترکی، کلام کا نمونہ دیا ہی، ترکی، اور فارسی تو اسکی مادری زبانیں تھیں، لیکن عربی کی تحریر بھی کم درجہ کی نہیں البتہ، چونکہ اس زمانے میں عموماً انشاپردازی لفاظی اور قافیہ بندی کا نام تھا اسیلیے خان خانان کا بھی یہی انداز ہے۔ افسوس اور سخت افسوس یہ ہی کہ مصنف نے چونکہ ایرانی تھا، بھاشا زبان کے نمونے دیے ورنہ اسبات کا سُراغ لگتا کہ اُردو نے بھاشا پر کیا تصرف کرنا شروع کر دیا تھا،

خان خانان کو عربی زبان میں یہ مہارت تھی کہ کہیں سے کوئی عربی تحریر آتی تھی، تو بغیر اسکے کہ اصل عبارت پڑھے، اسطرح ترجمہ پڑھتا چلا جاتا تھا کہ گویا کوئی لکھی ہوئی تحریر ہاتھ میں ہی جس کو دیکھکر پڑھتا جاتا ہی، ایک دفعہ شریف مکہ نے اکبر کو خط لکھا اور عبارت آرائی کے لیے بڑے بڑے مغلق اور دقیق الفاظ بھر دیے، اکبر نے ابوالفضل، فتح اللہ شیرازی، اور خان خانان کو حکم دیا کہ فارسی میں ترجمہ کر کے لائیں، ابوالفضل، اور فتح اللہ شیرازی، دونو اس خیال سے کہ ترجمہ کرنے کے لیے لغت کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوگی، تحریر کو ساتھ لیگئے لیکن خان خانان نے وہیں، روشنی کے سامنے لیجا کر خط پڑھنا شروع کیا، اور ساتھ کے ساتھ ترجمہ کرتا گیا،

فارسی زبان میں آج بھی اسکی ایک تصنیف موجود ہے، یعنی تزک بابری کا ترجمہ، بابر نے اپنے حالات اور واقعات ترکی میں قلمبند کیے تھے، اور تزک بابری نام رکھا تھا۔ اکبر کے فرمایش سے خان خانان نے اسکا ترجمہ کیا، نہایت سادہ، شستہ اور صاف فارسی ہی، خان خانان نے فارسی کا پورا دیوان مرتب کیا تھا لیکن یہ صرف مصنف آثر رحیمی

کی شہادت ہی کہیں اسکا نسخہ نظر سے نہیں گذرا، البتہ اشعار کثرت سے جا بجا پائے جاتے ہیں، مصنف نے بھی اکثر غزلیں اور رُباعیاں درج کی ہیں، اکثر ایسا ہوتا تھا کہ خانخانان خود کوئی مصرع طرح کرتا تھا، اور تمام دربار کے شعرا طبع آزمائیان کرتے تھے، لیکن جس معرکہ میں نظیری، عرفی، شکیبی، جیسے شعرا کا سامنا ہو، کلام کا سرسبز ہونا آسان بات نہیں تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر معرکون میں خان خانان ہی کے ہاتھ میدان رہا۔ چند است بند است فرزند است، خان خانان کی، دی ہوئی طرح ہو جسپر تمام شعرائے اکبری نے غزلیں لکھیں لیکن کیا ان شعروں کا جواب ہوسکتا ہے،

حدیث شوق نہ دانستہ ام کہ تا چند است	جز این قدر کہ دلم سخت آرزومند است
نہ دام دانم و نہ دانہ این قدر دانم	کہ پائے تا بسرم ہرچہ ہست در بند است
مرا فروخت محبت وے نہ دانستم	کہ مشتری چہ کس است و بہای من چند است
ازان بکشتم بہ سخنہائے دلکش تو رحیم	کہ اندکے بہ اداہائے دوست مانند است

ترکی کلام جو مصنف نے نقل کیا ہے چونکہ ہم اسکو سمجھ نہیں سکتے، اور نہ ناظرین میں کوئی ترکی دان ہو اسلیے ہمنے قلم انداز کردیا ہے،

مصنف نے لکھا ہے کہ فارسی میں جس قدر کہا تھا، اس سے کئی گُنا ہندی میں کہا ہے، لیکن اُن کا کھوج کون لگائے، ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خان خانان نے یورپ کی زبانون میں بھی مہارت پیدا کی تھی، اسکی ضرورت یہ پیش آئی کہ اکبر کو سلاطین یورپ سے مراسلت رہتی تھی، اس بناپر اسنے خان خانان کو یورپین زبانون کے سیکھنے کا حکم دیا، مصنف لکھتا ہے،

چون اکثر بنادر ہندوستان در تصرف مسیحیہ است × × و مکاتبات و مراسلات درمیانہ سلاطین اثر نچہ و خواقین ہندوستان بسیار واقع می شود بادشاہ ظل اللہ اکبر شاہ این سپہ سالار را بہ فرا گرفتن زبان عیسوی و بہم رسانیدن سواد و خط این قوم فرمان

دادبہ اندک اختلاط دہیچ ہے کہ باخاصان آن قوم کہ درپائے تخت بادشاہی بودند و
تجار و متردد دین ایشان نمود بہ دستورے تتبع آن خط و زبان آن قوم کرد کہ بے شائبہ
ریا بہتر از آن قوم می داند،

خان خانان کی ہفت زبانی کا اور مورخین نے بھی اعتراف کیا ہے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ دنیا کی اکثر مروج زبانوں میں وہ بات چیت کر سکتا تھا،

کتب خانہ

خان خانان کی علمی فیاضیوں کی ایک بڑی مثال، اسکا بے نظیر کتب خانہ تھا کتب خانہ اس درجہ کا تھا اور اس قدر علمی ذخیرے اسمیں مہیا کیے گئے تھے کہ بجائے خود ایک اکاڈمی یا دار الحکمت کا کام دیتا تھا، عرفی نظیری ظہوری شکیبی غرض اکثر شعرائے اکبری نے اپنے دیوان خود اپنے ہاتھ سے لکھکر اس کتاب خانہ میں داخل کیے تھے، دربار اکبری کے اکثر باکمال، اسی کتب خانہ کے تربیت یافتہ ہیں اکثر شعرا، خوشنویس صناع جن کو خان خانان تربیت دینا چاہتا تھا، کتب خانے کے کام پر مقرر ہوتے تھے اور ترقی کرتے کرتے نادرہ روزگار ہو جاتے تھے، کتب خانہ کا جو اسٹاف تھا اسکے مشہور ممبر ملا محمد امین جدول ساز، ملا عبد الرحیم عنبرین قلم، ملا محمد مومن، محمد حسین، کامی نمبرداری، بقائی بہرآبادی غنی ہمدانی تھے، کتب خانہ کی ترتیب و انتظام کیلیے اہل کمال کا ایک بڑا عملہ مقرر تھا، جو تمام نسخوں کی تکمیل کرتے تھے، تصویرین اور شبیہیں کھینچتے تھے مرقع طیار کرتے تھے، کتابوں کی لوح وغیرہ پر طلاکاری کا کام انجام دیتے تھے، ان میں سے بعض کے مختصر حالات ہم درج کرتے ہین،

شیخ عبد السلام

بھڑاینچ کے رہنے والے تھے، انکے والد بھاشا زبان کے مشہور شاعر تھے، اور پیمی تخلص کرتے تھے، وہ حج کو جانے لگے تو عبد السلام کو خان خانان کی خدمت میں دیتے گئے، خان خانان نے کتب خانے میں ان کی تعلیم و تربیت کرائی، رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی کہ کتب خانے کے داروغہ مقرر ہوئے، پھر مصاحب خاص کا رتبہ ملا،

ہندی زبان کی شاعری میں، بے نظیر تھے،

شجاع | شیراز وطن تھا، خط نسخ و ثلث میں نہایت کمال رکھتے تھے، سنہ ۹۹۹ ہجری میں بمقام ٹھٹھہ، خان خانان سے دربار میں آئے، اور ترقی کرتے کرتے کتب خانے کی افسری حاصل کی،

ملا عبدالرحیم عنبریں قلم | ہرات کے باشندے تھے، نسخ اور نستعلیق میں کمال حاصل کیا، اور ہرات سے خان خانان کے دربار میں آئے، خان خانان نے انکی تربیت پر خاص توجہ کی، رفتہ رفتہ اسقدر ترقی کی کہ محمد حسین کشمیری کے سوا اس زمانے میں خوشنویس میں کوئی شخص ان کا مقابل نہ تھا، خان خانان کے کتب خانے میں اکثر کتابیں انکے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں، بالآخر انکا شہرہ اسقدر بڑھا کہ اکبر نے اپنے یہاں بلالیا۔

ملا محمد امین | خراسان کے رہنے والے تھے، طلاکاری میں استاد تھے، مشہد مقدس میں امام ضامن علیہ السلام کے نام سے جو کتب خانہ ہے مدت تک اس میں کام کرتے رہے جب ازبکوں نے خراسان پر قبضہ کرلیا تو یہ وہاں سے نکلے، اور خان خانان کے دربار میں آئے۔ چار ہزار روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا، کتب خانے کی اکثر کتابیں انکی طلاکاری سے مزین تھیں ابری کاکاغذ انھیں کی ایجاد ہے،

ملا محمد حسین | ملا محمد مومن کے بھائی تھے، جلد سازی کے فن میں کمال رکھتے تھے، عکس کا کام بھی اعلیٰ درجہ کا کرتے تھے، ۳۵۔ برس کتب خانے کے ملازم رہے، مصنف مآثر رحیمی کے زمانے میں کتب خانہ کا تمام کاروبار انھیں کے ہاتھ میں تھا،

میر باقی ماوراءالنہری | ترکستان کے رہنے والے تھے، خاندان سے سید تھے، کتب خانے میں تربیت پائی، اور بالآخر افسری کی خدمت حاصل کی،

میاں ندیم | میاں فہیم جنکی نسبت یہ مثل مشہور ہے کہ کمائیں خان خانان اور اڑائیں فہیم، یہ اُن کے بھائی تھے، نقاشی اور مصوری میں ان کا جواب نہ تھا، کتب خانے ہی

میں تربیت پائی تھی،

بہبود | میرزا باقر ایک مشہور خوشنویس تھے، جو میر علی خوشنویس کے بھائی تھے، بہبود انکا غلام تھا، نقاشی اور خوشنویسی میں کمال پیدا کیا، اور کتب خانے میں ملازم ہوا،

مولانا مشفق | فنِ نقاشی میں یکتائے روزگار تھے، اور کتب خانے میں اسی کام پر مقرر تھے،

مادھو | ہندو بچہ تھا، تصویر، طراحی، مصوری، شبیہ سازی میں نادرہ روزگار تھا کتب خانے کی اکثر کتابیں، اسیکے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہیں،

دربار کے علما اور اطبا | علما اور اطبا کے حالات ہم تطویل کے خوف سے قلم انداز کرتے ہیں،

شعرا | مصنف نے شعرائے دربار کا تذکرہ نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کلام کا انتخاب بھی کثرت سے کیا ہے، البتہ یہ خصوصیت ملحوظ رکھی ہے کہ صرف وہ قصائد یا قطعے نقل کیے ہیں جو شعرانے خان خانان کی مدح میں لکھے ہیں، اسپر بھی کتاب کا بڑا حصہ اسمیں صرف ہوگیا ہے، شخصی سلطنت کا اثر دیکھو کہ تمام خان خانانی شعرا اکبر کے دربار سے منسوب ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے کے تمام شعرا جن کے نام سے ابو الفضل نے دراکبری کا مرقع سجایا ہے بجز دو ایک کے، سب کے سب، خان خانان یا ابو الفتح گیلانی کے پروردہ، اور تربیت دادہ ہیں، مصنف نے نہایت صحیح لکھا کہ،

ہر کہ تازہ از ولایت آمدہ بندگی و مصاحبت ایشان (ابو الفتح) اختیاری نمودہ × × چنانکہ خواجہ حسین ثنائی و مرزا قلی میلی و عرفی شیرازی و حیاتی گیلانی و سائر مستعدان درخدمت او بودہ اند،،

مصنف کا ایک بڑا احسان یہ ہے کہ خان خانان کے انتساب سے اُسنے تمام مشہور شعرا مثلاً عرفی، شکیبی، حیاتی، ظہوری، ملک قمی، نظیری نیشاپوری، محتشم کاشی، نوعی شیرازی، کے حالات اِس تفصیل سے لکھدیے کہ جو تذکرے، مخصوص تیموری شعرا کے حالات میں لکھے گئے ہیں، انمیں بھی یہ تفصیل نہیں ملسکتی،

یہ موقع شعرا کے حالات لکھنے کا نہیں ہے، لیکن خان خانان شعرا کو جسطرح تربیت کرتا تھا اور جسطرح ان پر فیاضیوں کا مینھ برساتا تھا، اسکے متعلق بعض واقعات لکھنے ضرور ہین،

خان خانان کی فیاضیوں کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ نوعی شیرازی کو سونے مین تلوا دیا نظیری نیشاپوری جب حج کرکے آیا ہے تو ایکدفعہ کسی موقع پر اسکی زبان سے نکل گیا کہ مین نے لاکھ روپیہ کا ڈھیر نہیں دیکھا، خان خانان نے لاکھ روپیہ منگواکر ڈھیر لگوا دیا، نظیری نے شکریہ ادا کیا کہ آپ کی بدولت مین نے آنکھ سے لاکھ روپے کا انبار دیکھ لیا، خان خانان سے زیادہ حسن طلب کا اداشناس کون ہو سکتا تھا. حکم دیا کہ روپے نظیری کے گھر پہونچا دیے جائین[۱]،،

فیضی اگرچہ شاہی تقرب کے لحاظ سے خان خانان کا ہمسر تھا چنانچہ خود کہتا ہے، مصرع ہم با اُمرا نظیر گشتم ۞ اور اسی وجہ سے اسنے عرفی وغیرہ کیطرح اُمرائے شاہی میں کسیکی مدح نہیں کی تاہم اسکو کہنا پڑا کہ ؎

خان خانان عہد کالفامش	طبع را رخصت شگفتن داد
داشت چون اعتماد بر شعرا	صلہ پیش از مدیح گفتن داد

فیضی پھر بھی شاعر تھا، اسلیے خان خانان جو بے وجہ بھی شعرا کو صلے اور انعام دیتا رہتا تھا فیضی نے اسکی وجہ یہ قرار دی کہ خان خانان کو شعرا پر اعتماد تھا یعنی روپے لیکر مفت نہ کھا جائینگے، بلکہ مدح وثنا سے اسکا معاوضہ ادا کرینگے، لیکن فیضی کو یہ معلوم نہ تھا کہ خان خانان شعرا کے ساتھ جو فیاضی کرتا تھا، اس سے ادب اور انشا کی ترقی مقصود تھی،

ان فیاضیونکے چرچے عرب و عجم تک پھیلے ہوئے تھے مصنف نے لکھا ہے کہ شکیبی اصفہانی جب حج کرنے کی غرض سے عدن پہونچا تو بچے گیت گا رہے تھے کہ خانان

[۱] خزانۂ عامرہ تذکرہ نوعی و نظیری،

خانان آیا جسکی بدولت کنواریوں نے شوہر پائے، تاجروں نے اسباب بیچے، بادل برسے، جل تھل بھر گئے" شکیبی بے ساختہ رو پڑا، اور اسی وقت یہ رباعی موزون کی،

زین دانہ کہ از نام نکو کاشتۂ — از اختر سعد خرمن افراشتۂ
زان گونہ جہان بہ جود انباشتۂ — کز مور کفاف دانہ برداشتۂ

ان فیاضیوں کے قصے گو دلچسپ ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ ان سے مزہ اٹھانا گدا طبعی کی دلیل ہے، خدا بخشے عرفی کو سچ کہا ہے،

بیا بہ ملک قناعت کہ دردسر نہ کشی — ز قصہ ہا کہ بہ ہمت فروش طے بستند،

البتہ یہ نکتہ لکھنے کے قابل ہے کہ خان خانان اسکے ساتھ شعرا کی تربیت کرتا تھا اسکے کلام کی تنقید کرتا تھا کبھی کبھی اصلاح دیتا تھا جس کا یہ نتیجہ تھا کہ شعرا کا کلام روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا خود شعرا کو بھی اس بات کا اعتراف تھا، رسمی اپنے مشہور قصیدہ میں لکھتا ہے،

زمین مدح تو آن نغمہ سنج شیرازی — رسید صیت کلامش بروم از خاور
بہ طرز تازہ ز مدح تو آشنا گردید — چو روے خوب کہ یابد ز ماشطہ زیور

اکثر شعرا کے دیوان، خان خانان ہی کی توجہ سے مرتب اور شائع ہوئے، عرفی جب مرنے لگا تو دیوان کا مسودہ، خان خانان کے ہان بھیجدیا، لیکن مسودہ نہایت ابتر تھا اور کاٹ پھانس کیوجہ سے بیکار ہوگیا تھا، خان خانان نے محمد قاسم مشہور بہ سراج خلف خواجہ محمد علی اصفہانی کو اسکی ترتیب پر مامور کیا، سال بھر کی شبانہ روز محنت کے بعد مسودہ صاف ہوا، خان خانان کو نہایت مسرت ہوئی، محمد قاسم کو بہت انعام واکرام دیا، چنانچہ محمد قاسم نے ایک نظم میں یہ واقعات ادا کیے، چند شعر یہ ہیں،

عرفی آن واضع سخن کہ براد — رشک دارد روان شروانی
بعد چندے چو جائے بودن نیست — رفت ازین دیر ششدر فانی

باندازو دو رشاہوارے چند ... کش قرین نیست بحرے و کانی
لیک آن جملگی پراگندہ ... ہمہ از بے سری و سامانی
آن قدر مہلتش نہ داد اجل ... کہ بہ ترتیب شان بود بانی
گفت با دوستان بگاہ وداع ... کاے عزیزان حسبی و جانی
برسانید زادہائے مرا ... بہ جناب معلّم ثانی
ہیچ دانی کہ چیست آن مرکز ... کہ تو عمان و کانیش خوانی
صاحب حلم و علم و سیف و قلم ... خان خانان سکندر ثانی
دید چون زادہاے عرفی را ... ہمہ محسود لعل و یگانی
بعدیک چند بندہ را فرمود ... کہ دہم شان نظام دیوانی
مدتے چند خون دل خوردم ... تا کہ جمع آمد از پریشانی
از خرد خواستم چو تاریخش ... گفت ترتیب دادہ نادانی

یہ نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ عرفی، نظیری، شکیبی، وغیرہ نے اکبر، اور جہانگیر اور مراد کی شع میں اکثر قصیدے لکھے ہیں، لیکن ان قصیدوں کو خان خاناں کے مدحیہ قصیدوں سے ملاؤ تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے، خان خاناں کے مدحیہ قصائد میں صاف نظر آتا ہے کہ شاعر جوش اور اخلاص سے لبریز اور بادۂ کرم کے نشہ میں چور ہے، یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس سرمستی میں اس سے بھی غافل نہیں کہ مخاطب کی نظر ایک ایک لفظ پر ہے اور اسلیے شاعری اور اُستادی کی اُصول سے بال برابر بھی، تجاوز نہیں کرسکتا، خان خاناں کے بیٹا پیدا ہوا ہے، عرفی تہنیت کا قصیدہ لکھکر بھیجتا ہے۔ تمہید میں جوش زور طبیعت اور شاعرانہ معشوق پن کا ناز دیکھو،

بود در کتم عدم، بکر طبیعت را جائے ... کہ خرد بر سرش استادہ ہمی گفت برائے

عقل کی درخواست کے بعد، دوشیزہ طبیعت جواب دیتی ہے،

گوشہ گیر د جگر می خورد تلخی می کش — تا بہ عہدے کہ شود صاحب توبلک آرائے
خلق از مژدہ، بر و مژدہ شنو جمع شوند — ہمہ گوہر طلب گوہری و گنج ستائے
چرخ آمادہ شود، زہرہ مہیا گردد — او کشد بند نقاب من و من بند قبائے
من بہ صد ناز و کرشمہ ہمہ رنگ و ہمہ بوئے — بر درِ حجلہ ارکان نہم از خلوت پائے

رفاہ عام اور صنعت و زراعت کے ترقی کے کام

ہندو تو آج یہ شکایت کر رہے ہیں کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر، ملک کو تباہ کر دیا، لیکن ان کوتاہ نظروں کو معلوم نہیں کہ مسلمانوں نے، ہندوستان کی افتادہ زمین کو چمن زار بنا دیا تھا، دُنیا جانتی ہے کہ ہندو پہلے پتّوں پر رکھ کر کھانا کھاتے تھے ننگے پانوں رہتے تھے، زمین پر سوتے تھے، بن سلے کپڑے پہنتے تھے، تنگ مکانوں میں بسر کرتے تھے مسلمانوں نے آکر ان کو کھانے پینے، رہنے، سہنے، وضع لباس، فرش فروش، زیب و زینت، کا سلیقہ سکھایا، لیکن یہ موقع اس مضمون کے پھیلانے کا نہیں ہے،

البتہ یہ بات یہاں جتانے کے قابل ہے کہ باوجود اس کے ہندوستان زراعتی ملک ہے، جتنے عمدہ قسم کے پھل اور میوے ہیں سب مسلمانوں کے لائے ہوئے ہیں، سیب، ناسپاتی، انگور، خربزہ، سنترے وغیرہ وغیرہ کا یہاں پہلے نام و نشان بھی نہ تھا، ان چیزوں میں سے خربزہ کی پیداوار کا فخر، خان خانان کو حاصل ہے مصنف مآثر رحیمی لکھتا ہے کہ ہندوستان میں خربزہ نہیں ہوتا تھا، ایران اور خراسان سے آتا تھا، سب سے پہلے خان خانان نے، عراق اور خراسان سے تخم منگوائے، اور بلگواڑہ علاقہ گجرات میں آب و ہوا کی مناسبت کے لحاظ سے ایک قطعہ انتخاب کر کے اسکی کاشت کرائی دو تین سال میں ایسے اچھے خربزے پیدا ہونے لگے کہ ولایت کی برابری کرتے تھے،

عمارات

خان خانان نے تمام مشہور مقامات، دہلی، لاہور، آگرہ، گجرات میں، باغ،

جنکا نام :: سرائیں تعمیر کرائی تھیں، مصنف نے اِن کا حال تفصیل سے لکھا ہے،

حمام ہندوؤں کے حمام، دریا کے گھاٹ ہیں، جو آجتک موجود ہیں، مسلمانوں کے عہد میں، اُمرا اور رؤسا اپنے گھروں میں حمام بنواتے تھے، لیکن پبلک حمام مطلق نہ تھے، سب سے پہلے خان خانان نے گجرات میں محمد علی معمار کے زیر اہتمام حمام بنوایا اور وقف عام کر دیا، اُسوقت سے حمام کا عام رواج ہو گیا،

جہازات خان خانان نے تین جہاز طیار کرائے تھے، جنکا نام رحیمی، کریمی، اور سالاری رکھا تھا، یہ جہاز صرف اس غرض سے تھے کہ حج کے موسم میں غریب حاجیوں کو مفت حج کرنا نصیب ہو،

ابری اور عکس کا کاغذ جلد بندی کے کام کے لیے ابری کا کاغذ، خان خانان کے کاریگروں کی ایجاد ہے، عکس کا کاغذ پہلے بھی تھا، لیکن عکس، ہفت رنگ اس کے عہد کی ایجاد ہے،[1]

ذاتی ہنر اور اخلاق و عادات خان خانان نے علوم و فنون کے علاوہ سپہگری کی نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائی تھی، اُسکے جنگی کارنامے گجرات، اور سندھ کے فتوحات ہیں جنکے لیے تاریخی دفتر دیکھنے چاہئیں، یہاں روزمرہ کی باتیں لکھی جاتی ہیں۔

تیراندازی میں قدر انداز تھا، گجرات میں جب مظفر پر فتح حاصل کی ہے تو ایک دفعہ میدان میں گیند کھیل رہا تھا، ایک کوا ہوا میں اُڑا جاتا تھا، خان خانان نے پے در پے اس کے چاروں طرف تیروں کا دائرہ بنا دیا، چنانچہ بارہ تیر مارے، بالآخر تیرھویں تیر سے مار کر گرا دیا، سنجر کاشی مشہور شاعر، موقع پر موجود تھا، برجستہ یہ رُباعی موزوں کر کے پڑھی،

در عرصۂ دست بردت ای رزین جنگ	ابسیار چنان بود کہ یک چوبۂ خدنگ
از چلکدی باز نہ تو در روی ہوا	دُنبالۂ ہم گرفتہ چون خیل کلنگ

[1] افسوس ہے عکس کے کاغذ کا مفہوم ہم نہیں سمجھ سکے، معلوم نہیں کیا چیز تھی،

یعنے تو اِس تیزی سے تیر پھینکتا ہے کہ ہوا میں تیرون کی اسطرح قطار قائم
ہوجاتی ہے جسطرح کلنگ قطار باندھ کر اُڑتے ہین،

ایک دفعہ ایک شیر کی پیشانی پر تیر مارا کہ سوفار تک اُتر گیا، اسی شاعر نے ایک قطعہ مین
اس واقعہ کو ادا کیا ہے جسکا ایک شعر یہ ہے،

ناوکے دلدوز بر پیشانی آن شیر زد	کز سر سوفار آن بنمود زخم ابن بان

بارہا شیرون اور بھیڑیون کو تلوار سے مارا ہے، چنانچہ مصنف نے متعدد واقعات
نقل کیے ہین،

ورزش

ورزش میں عجیب عجیب مشقیں پیدا کی تھیں، ایک رومال چار آدمیوں کے ہاتھ
میں دیدیتا تھا کہ چاروں کونے تھام کر تانے کھڑے رہیں، خود دوڑتا ہوا آیا، قریب پہونچکر اُچھلا
اور رومال پر قدم رکھتا ہوا اس صفائی سے نکل گیا کہ رومال پر آسیب نہ آنے پایا، مصنف
نے لکھا ہے کہ یہ اُس زمانے کا واقعہ ہے جب خان خانان کی عمر ستتر برس کی تھی، ہمنے
کرناٹک کے بازیگروں کو اکثر یہ تماشہ کرتے دیکھا ہے، خان خانان نے انھیں لوگوں
سے تعلیم پائی ہوگی،

اخلاق حلم و عفو

باوجود اس اقتدار، اور عظمت کی حُسن اخلاق کے مجسم تصویر تھا جس زمانے
میں خان خانان کا خطاب ملا ہے، چند نصیحت آمیز فقرے، ایک کاغذ پر لکھ کر نوکروں
کو دیے، کہ جب مجھے کسی بات یا کسی پر غصہ آئے تو اسکو پیش کر دینا، چنانچہ کتنا ہی غیظ و
غضب میں ہوتا تھا اس کاغذ کے پیش ہونے کے ساتھ، ٹھنڈا ہوجاتا تھا،

ایک دفعہ، پانوں میں زخم ہوگیا تھا مدت تک دربار نہ کرسکا، زخم ابھی آئے تھے، کہ
کسی ضرورت کی وجہ سے باہر نکلا، ہجوم عام میں ایک نوکر کا پانوں، اسکے پانون پر پڑگیا
اور زخم پھٹ گیا، مصاحبون نے نوکر کو سزا دینی چاہی، خان خانان نے روکا کہ اسکا
کیا قصور ہے ایک اتفاقیہ بات تھی،

مصنف نے اور بہت سے واقعات نقل کیے ہیں، ہم اس لحاظ سے قلم انداز کرتے ہیں کہ خان خانان کو نظر نہ لگ جائے،

اس کتاب (مآثر رحیمی) میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ خانخانان کی خوبیاں ہی خوبیاں گنائی ہیں، نکتہ چینی کا نام نہیں، حالانکہ آج کل کے مذاق کے موافق سوانح عمری اور لائف کی یہ ضروری شرط ہے، لیکن اس طریقہ کو ہم آج کل کے پُر فریب طریقے سے زیادہ پسند کرتے ہیں جسمیں راست نویسی اور تنقید کا بہت کچھ دعویٰ کر کے بھی سوانح عمری کے بجائے مناقب کی کتاب لکھی جاتی ہے، اور کوئی عیب ہے وہ بھی خفیف کر کے لکھا جاتا ہے، تو اس غرض سے کہ محاسن کے یقین کرانے کے کام آئے، یعنے جب عیب نہیں چھپایا ہے، تو محاسن کیوں غلط لکھے ہونگے، بہتر سے بہتر سوانح عمری جو ہماری زبان میں لکھی گئی ہے اس طریقے کی عمدہ مثال ہے،

اب ہم خان خانان سے رخصت ہوتے ہیں، خدا نے چاہا تو شعر العجم میں، پھر نیاز حاصل ہوگا،

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ، سُن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ،

جہانگیر

اور

توزک جہانگیری

بہ من چندان گنہ از بدگمانی میکند نسبت
کہ من ہم در گمان افتادہ پندارم گنہگارم

یورپ کے بیدرد واقعہ نگاروں نے سلاطین اسلام کی غفلت شعاری عیش پرستی سیہ کاری کے واقعات کو اِس بلند آہنگی سے تمام عالم میں مشہور کیا کہ خود ہمیں کو یقین آچلا اور تقلید پرست تو بالکل یورپ کے ہم آہنگ بن گئے۔

ہندوستان کے سب سے بڑے انشاپرداز نے نیرنگ خیال میں جہانگیر کی یہ تصویر کھینچی ہے، اسکے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا، وہ خود مخمور نشہ میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال (نور جہان) اُسکا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی وہ جو کچھ دیکھتا تھا اُس کے نور جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اُسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اِس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھکر سب مُسکرائے مگر چونکہ دولت اُسکے ساتھ ساتھ تھی۔ اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا۔ اِس لیے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا"

لیکن آؤ دیکھیں اِس جھوٹ میں کچھ سچ بھی ہے۔ ہمارے انشاپرداز نے جہانگیر کے کبھی کبھی ہوش میں آجانے کا جو کارنامہ بتایا ہے وہ اُسکی کتاب **توزک جہانگیری** ہے،

اور سچ یہ ہے کہ جہانگیر کے طرز عمل اور ہر قسم کے خیالات کے دریافت کرنے کا اس سے زیادہ صحیح ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہم اس رسالہ میں اسی کتاب پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت (جس کو سب سے پہلے بیان کرنا چاہیئے) یہ ہے کہ وہ واقعات کا نہایت صحیح اور سچا مرقع ہے، اس کا ہر ہر لفظ شہادت دیتا ہے کہ کتاب کا لکھنے والا کسی واقعہ میں کسی قسم کی رنگ آمیزی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ حکمت عملی اور پالٹیکس کے فلسفہ سے بالکل ناواقف ہی، وہ بدنما واقعات پر ملمع سازی کا روغن نہیں چڑھا سکتا۔ وہ عیب بھی کرتا ہے تو ڈنکے کی چوٹ کرتا ہی اور ہنر کا کوئی کام اُسکے ہاتھ سے بن آتا ہے تو داد طلب خاموشی نہیں اختیار کرتا بلکہ علانیہ فخر کا اظہار کرتا ہی مورخین کو اپنے تجسس اور رازجوئی پر ناز ہے کہ اُنھوں نے ابوالفضل کے قتل کی سازش دریافت کر لی لیکن جہانگیر خود صاف صاف لکھتا ہی،

"راجہ نرسنگھ دیو از راجپوتان بندیلہ بہ منصب سہ ہزاری سرفرازی یافت و باعث ترقی و رعایت او آن شد کہ در اواخر عہد پدر بزرگوارم شیخ ابوالفضل را کہ از شیخ زادہائے ہندوستان بہ مزیت فضل و دانائی امتیاز تمام داشت۔ طلب داشتند وچون خاطر او بمن صاف نبود۔ یقین بود کہ اگر دولت ملازمت دریابد باعث زیادتی آن غبار خواہد گشت و مانع دولت مواصلت گردیدہ کار بجائے خواہد رسانید کہ بضرورت از سعادت خدمت محروم باید گردید۔ چون بولایت نرسنگھ دیو سر راہ او واقع بود باو پیغام فرستادم کہ اگر سر راہ بران مفسد فتنہ انگیز گرفتہ او را نیست و نابود سازند بہ مایۂ عنایتہائے کلی از من خواہد یافت"!

اپنے بیٹے شاہجہان کو شراب پلواتا ہی تو بے تکلف لکھتا ہے،

"دو تا سال حال کہ سن شش بہ بیست و چہار سالگی رسیدہ و کدخدایہا کردہ و صاحب فرزندان

شدہ اصلا خود را بخوردن شراب آلودہ نساختہ بود، این روز کہ مجلس وزن او بود گفتم کہ بابا! صاحب فرزندان شدہ، بادشاہان و بادشاہزادگان شراب خوردہ اند امروز کہ روز جشن تست ترا شراب می خورانم و رخصت می دہم کہ در روزہائے جشن و ایام نوروز و مجلس ہائے بزرگ میخوردہ باشی اما طریقۂ اعتدال مرعی داری؛

اِس قسم کے سیکڑوں واقعات ہیں جن سے بداہتہً ثابت ہوتا ہے کہ اُس نے جہان جو کچھ لکھا ہی سچائی کے جادہ سے بال برابر بھی نہیں ہٹا ہے،

قدرت زبان — ایک اور خصوصیت جو قوت تحریر سے متعلق ہی اور جس کو اصل مقصد سے پہلے بیان کرنا چاہیئے یہ ہی کہ وہ ہر قسم کے واقعات کو جس خوبی، سادگی، صفائی اور بے تکلفی سے بیان کر سکتا ہے اور ساتھ ہی زبان کا لطف قائم رکھتا ہی فارسی انشا پردازون میں کسی سے بن نہیں آسکتا۔ اختصار کے لحاظ سے ہم ایک دو مثالون پر اکتفا کرتے ہین؛

چونکہ اُنکو علم الحیوانات کے ساتھ خاص شغف تھا دور دراز ممالک میں گماشتے مقرر کیئے تھے کہ ہر قسم کے عجیب و غریب جانور جہان سے جس قیمت پر ہاتھ آئیں شاہی عجائب خانے کے لیے روانہ کیئے جائیں۔ چنانچہ سنہ ۱۰۲۱ہجری میں مقرب خان بندر کھمبات سے جو عجیب و غریب جانور ساتھ لایا اُن میں پیرو بھی تھا جسکو آج انگریزی مرغی کہتے ہیں۔ اسکی تصویر جہانگیر ان الفاظ میں کھینچتا ہی،

"یکے از جانوران در جثہ از طاؤس مادہ کلان تر و از نر فی الجملہ خورد تر گاہے کہ در مستی جلوہ نماید دُم خود را و دیگر پرہا را طاؤس آسا پریشان می سازد و برقص درمی آید سر و گردن و زیر حلقوم او ہر ساعت برنگے ظاہر می گردد۔ وقتیکہ در مستی ست سرخ سرخ ست گویا کہ تمام را بہ مرجان مرصع ساختہ اند و بعد زمانے ہمین جاہا سفید می شود و بطریق پنبہ بنظر درمی آید۔ بوقلمون آسا ہر زمان برنگے دیگر دیدہ می شود و دو پارچہ گوشتی کہ بر سر دارد

تاج خروس مشابہ است۔ غریب این است کہ در ہنگام مستی پارچہ گوشت مذکور بطریق خرطوم از بالائے سراوتا یک وجب آویز دو باز کہ آن را بالا می کشد چون شاخ کرگدن بر سر او بمقدار دو انگشت نمایان میگردد، اطراف چشم او ہمیشہ فیروزہ گون ست،،

ایک اور پرندہ کی تصویر کھینچتا ہے،،

"یکے از خصوصیات این جانور آن ست کہ تمام شب پائے خود را بر شاخ درختے بند کردہ خود را سرشیب سے ساز دو با خود زمزمہ می کند و چون روز شد بالائے آن درخت می نشیند"

اسی طرح وہ جشنوں کی چہل پہل لڑائیوں کی ہل چل شکاروں کی دوڑ دھوپ موسموں کی دلاویزی۔ باغوں کی تروتازگی۔ آپس کی صحبتوں کی رنگینی کو ایسے بے تکلف برجستہ اور دلاویز طریقہ سے ادا کرتا ہے کہ بڑے بڑے نامور انشاپرداز نہیں کر سکتے ان خصوصیتوں کے بیان کرنے کے بعد اب ہم اُن حالات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یورپ کے مورخین اسکی زندگی کا جو نقشہ کھینچتے ہیں کہاں تک صحیح ہے۔

تورک جہانگیری اس کا روزانہ روزنامچہ ہے، اس میں وہ تاریخ اور تمام واقعات جو اُسکو پیش آتے ہیں اور جن اشغال میں وہ مشغول رہتا ہے تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی عمر کا بڑا حصہ ملک کے دورہ میں صرف ہوا ہے جس کے ذریعہ سے وہ ملک اور رعایا کے حالات سے اطلاع حاصل کرتا تھا۔ اس خصوصیت میں وہ اپنے تمام پیشروؤں اور جانشینوں سے بڑھا ہوا ہے کہ اُس کے سفر کی مدت اور سفر کے حدود سب سے زیادہ وسیع ہیں،

دورہ کے روزانہ حالات جو وہ قلمبند کرتا ہے اُسمیں عیش و عشرت کا حصہ بہت کم نظر آتا ہے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ اِن واقعات کو قلم انداز کرنا چاہتا ہے شبستان عیش میں بسر کرنا شراب کے جلسے قائم کرنے جشن آرائی کی دھوم دھام نغمہ و سرود کی مجلسیں،

اِن تمام واقعات کو وہ نہایت مزے لیکر بیان کرتا ہے۔ لیکن جب اِس قسم کے حالات کو اُسکے ملکی اور علمی اشغال سے موازنہ کیا جاتا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ ان تفریحی اشغال کو اُس نے اُسی حد تک جائز رکھا تھا جس قدر آج یورپ نے باوجود کمال تہذیب کے جائز رکھا ہے۔

مہمات ملکی کیطرف توجہ

ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی وہ بڑی مہمات پر فوجیں بھیج رہا ہے، کبھی ایک غریب بڑھیا کی ایک طاقتور درباری کے مقابلہ میں دادرسی کر رہا ہے کبھی علاقہ کی پیمائش میں مصروف ہے۔ کبھی صوبہ جات کے گورنروں کے نام احکام جاری کر رہا ہے۔ کبھی ملکی پیداوار کی تحقیقات میں مصروف ہے کبھی سرحدی حکمرانوں سے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کبھی علما کی مجلس میں شریک ہے۔ کبھی غیر مذہب والوں سے علمی مباحثے کر رہا ہے۔ اِسی حالت میں کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو ارباب نشاط اور نغمہ سرود سے بھی دل بہلا لیتا ہے۔ اگر یہ جرم ہے تو سب کو اس جرم کا مرتکب ہونا چاہیئے۔ ع سہ ماہ مے خور و نہ ماہ پارسا می باش۔

اپنے تخت پر بیٹھنے کے ساتھ پہلا حکم جو صادر کیا وہ زنجیر عدالت کا آویزاں کرنا تھا۔ شخصی حکومتوں میں رعایا کی دادرسی میں جو امر سب سے بڑا وقت طلب ہوتا ہے وہ بادشاہ کے دربار کی رسائی ہے۔ نقیب و چاؤش۔ حاجب۔ دربان۔ خدم و حشم کے ہجوم میں مظلوموں کا بادشاہ تک پہونچنا ایک طرف اُن کی آواز بھی نہیں پہونچ سکتی!

جہانگیر نے سب سے پہلے اسکی طرف توجہ کی اور حکم دیا کہ ایک زنجیر قلعہ کے برج سے دربار تک لٹکائی جائے تاکہ جو مظلوم شاہی دربار تک نہ پہونچ سکے اس زنجیر کو ہلا دے،

جب کوئی شخص اِس زنجیر کو ہلاتا تھا تو قلعہ میں خبر ہو جاتی تھی اور جہانگیر اُسی وقت باہر نکل آتا تھا اور اُسکی دادرسی کرتا تھا!

جہانگیر کی نفاست پسندی نے یہاں بھی کام کیا یعنے زنجیر زرِ خالص سے تیار کیگئی، یہ زنجیر ۳۰ گز لمبی تھی اور ۴ من وزن تھا۔ اس میں ساٹھ گھنگرو تھے جو زنجیر ہلانے سے بجتے تھے!

اسکے علاوہ تخت نشینی ہی کے ساتھ اسنے دوازدہ گانہ احکام صادر کیئے جنکی تفصیل یہ ہے:

(۱) تمغا۔ اور میر بحری۔ اور وہ ٹکس جو ہر صوبہ کے جاگیرداروں نے مقرر کیئے تھے، عموماً موقوف کردیئے۔

(۲) جن راستوں میں ڈاکے پڑتے تھے حکم دیا کہ منزل بہ منزل سرائیں۔ کوئیں اور مسجدیں تیار کرائی جائیں۔ تاکہ لوگ آباد ہو جائیں اور چوری وغیرہ نہونے پائے۔ اسکے ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ سوداگروں کا مال اسباب اُنکی مرضی کے بغیر کوئی کھولنے نہ پائے۔

(۳) اب تک یہ قاعدہ تھا کہ جو شخص مرجاتا تھا اُسکا مال ضبط ہوکر خزانہ شاہی میں داخل ہوتا تھا۔ اگرچہ اکثر وارثوں کو واپس ملتا تھا۔ لیکن یہ شاہی احسان سمجھا جاتا تھا جہانگیر نے حکم دیا کہ جائداد و مال وارثوں کا حق ہے، کسی کو اسمیں تصرف کا حق نہیں البتہ جو شخص لاوارث مرجائے اُس کا مال بیت المال میں داخل ہو لیکن وہ بھی صرف پبلک ورکس یعنی سراؤں۔ پلوں۔ تالابوں کی تیاری میں صرف کیا جائے!

(۴) تمام ممالک محروسہ میں شراب اور دیگر مسکرات بکنے نہ پائیں۔ جہانگیر نے جہاں اس حکم کا ذکر کیا ہے انصاف پسندی کے ساتھ اپنے جُرم کا اعتراف کیا ہے، چنانچہ لکھتا ہے:-

"با آنکہ خود بخوردن شراب ارتکاب می نمایم"!

(۵) کسی کے مکان میں سرکاری ملازمین اُترنے نہ پائیں!

(۶) ناک کان کاٹنے کی جو سزائیں دیجاتی تھیں یک قلم موقوف کردیں،

(۷) رعایا کی زمین زبردستی خالصہ میں شریک نہ کیجائے،

(۸) ملازمین شاہی اپنے علاقونمیں بغیر اجازت کے شادی نہ کرنے پائیں۔

(۹) تمام بڑے بڑے شہروں میں شفا خانے قایم کیئے جائیں اور طبیب و جرّاح مقرر ہوں اور یہ تمام صرف جیب خاص سے ادا کیا جائے،

(۱۰) ۱۸- ربیع الاول (تاریخ ولادت جہانگیر) اور جمعرات او رہفتہ کو جانور ذبح نہ کیئے جائیں،

(۱۱) عام حکم دیا کہ والد ماجد (اکبر شاہ) کے زمانے کے تمام مناصب اور عہدے برقرار رکھے جائیں،

(۱۲) جسقدر قیدی قلعوں میں اور جیلخانونمیں مقید تھے سب آزاد کردیئے[1]،

جغرافیانہ اور مورخانہ تحقیقات ہندوستان کی سیکڑوں تاریخیں لکھی گئیں جن میں حکومت اور فتوحات کے حالات ہیں لیکن کوئی کتاب جغرافیہ کے طرز پر نہیں لکھی گئی جس سے ایک ایک شہر اور قصبہ کے حالات معلوم ہوتے۔ اِس انداز کی سب سے پہلی کتاب آئین اکبری ہے جسمیں نہایت اجمالی حالات ہیں، آجکل گزیٹر کا جو طریقہ ہے۔ یہ اس عہد میں بالکل نہ تھا لیکن اسکا خاکہ درحقیقت جہانگیر نے قائم کر دیا تھا۔ توزک جہانگیری میں وہ جس صوبہ یا جس شہر کا حال لکھتا ہے اسکی ابتدائی تاریخ مساحت۔ پیداوار کے اقسام۔ آب و ہوا۔ اثمار و اشجار۔ رسوم و عادات۔ ایک ایک چیز کو نہایت تفصیل سے لکھتا ہے۔ مثلاً کشمیر کے حال میں لکھتا ہے،

> کشمیر اقلیم چہارم میں شامل ہی۔ اسکا عرض بلد خط استوا سے ۳۵ درجہ اور طول جزائر سفید سے ۱۰۵ درجہ ہے۔ مدت سے یہ ملک ہندو راجاؤں کے قبضہ میں تھا چنانچہ ان کی کل مدت حکومت ۰۰۰۰ ہم سال ہے۔ جسکے تفصیلی حالات راجہ ترنگ کی تاریخ میں جس کا ترجمہ

[1] دیکھو تزک جہانگیری مطبوعہ نو لکشور صفحہ ۱۵

عرش آشیانی (اکبر) کے حکم سے فارسی میں ہو چکا ہے بہ تفصیل مذکور ہیں۔ سنہ ۷۱۲ ہجری میں مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ ۳۲ حکمرانوں نے ۲۸۲ برس تک حکومت کی سنہ ۹۹۴ ہجری میں عرش آشیانی (اکبر) نے فتح کیا،

کشمیر کا طول پہلو لباس سے نشیبی حصہ تک ۵۶ کوس ہے۔ اور عرض ۱۷ کوس ابوالفضل نے اکبر نامہ میں یون ہی قیاساً لکھ دیا ہے کہ کشمیر کا طول دریائے کشن گنگا سے ۱۲۰ کوس ہے۔ میں نے بہ نظر احتیاط ماہران فن کو مقرر کیا کہ طول اور عرض کی پیمائش کریں۔ ابوالفضل نے ۱۲۰ کوس جو لکھے وہ کل ۶۷ ٹھہرے۔ قاعدہ یہ ہے کہ ہر ملک کی سرحد وہان تک قرار دیجاتی ہے جہان تک اِس ملک کی بولی۔ بولی جاتی ہے۔ اِس بنا پر پہلو لباس سے کشمیر کی سرحد مقرر کی گئی ہے جو دریائے کشن گنگ سے اامیل اِس طرف ہے۔

شہر کا نام سری نگر ہے دریائے بھٹ شہر کے بیچ میں بہتا ہے۔ اِس دریا کا مخرج ایک چشمہ ہے جس کا نام ویری ناگ ہے جو سری نگر سے ۱۴ کوس ہے میں نے اِس چشمہ پر ایک باغ اور عمارت طیار کرائی ہے شہر میں چار پل نہایت مستحکم اور مضبوط ہیں۔ پل کو کشمیری زبان میں کدل کہتے ہیں۔ یہان ایک نہایت عالیشان مسجد ہے جو سلطان سکندر نے سنہ ۸۰۰ ہجری میں طیار کرائی تھی۔ محراب سے شرقی دیوار تک ۱۴۵ گز طول، اور ۱۴۴ گز عرض ہے۔ میر سید علی ہمدانی کی ایک خانقاہ یہان یادگار ہے یہان آمد و رفت کشتی کے ذریعے سے ہے۔ ۵۷۰۰ کشتیان اور ۷۴۰۰ ملاح ہین،

کشمیر میں ۳۸ پرگنہ جات ہیں۔ بالائی حصہ کو امراج اور نشیبی کو مراج کہتے ہیں یہاں مالگزاری میں نقدی دینے کا دستور نہیں۔ بلکہ بٹائی کا طریقہ ہے۔ ایک خروار تین من آٹھ سیر کا ہوتا ہے۔ اِس حساب سے کشمیر کی مالگزاری ۳۰ لاکھ ۶۳ ہزار ۵۰ خروار ہے جس کو نقدی سے بدلیں تو سات کرور ۴۶ لاکھ ستر ہزار دام ہوتے ہیں (دام قریباً سوا پیسہ کا ہوتا ہے)۔

کشمیر کا راستہ سخت دشوار گذار ہے۔ نسبتہً سب سے آسان راستہ بھمیر اور پگلی کا ہے لیکن کشمیر کی بہار دیکھنی ہو تو پگلی کے راستہ سے جانا چاہیئے"

کشمیر ایک ہمیشہ بہار چمن زار ہے۔ جہان تک نگاہ کام کرتی ہے۔ سبزہ۔ آبِ روان گلاب بنفشہ۔ نرگس اور سیکڑون قسم کے پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ بہار میں نہ صرف صحرا اور چمن۔ بلکہ در و دیوار۔ صحن و بام۔ لالہ سے پٹ جاتے ہیں"

کشمیر کے تمام مکانات چوبین ہوتے ہیں جو دو منزلے سہ منزلے ہوتے ہیں۔ بالاخانہ کو خاکپوش کرکے اس میں لالہ بوستے ہیں جو بہار میں پھولتا ہے اور عجب عالم پیدا کرتا ہے۔ یہ خاص کشمیر کی ایجاد ہے"!

کشمیر کے مضافات میں پھولوں کی اقسام کا شمار نہیں ہوسکتا۔ اُستاد منصور نقاش نے میرے حکم سے جتنے پھولوں کی تصویرین لین ان کی تعداد سو سے متجاوز تھی۔ عرش آشیانی سے پہلے یہان شاہ آلو مطلق پیدا نہیں ہوتا تھا۔ محمد قلی افشار نے کابل سے لاکر پیوند لگایا۔ اب تک دس پندرہ درخت طیار ہو چکے ہیں"

(اسکے بعد تمام میوہ جات اور پیداوار اور حیوانات اور لوگون کی معاشرت اور رہنے سہنے کا حال لکھا ہے۔ اس مختصر رسالہ میں انکی گنجایش نہیں)۔

انصاف کرو ایک محقق جغرافیہ دان اور مورخ کسی ملک کا حال اس سے زیادہ کیا لکھ سکتا تھا۔ باوجود اسکے یوروپین مورخون کی ناانصافی اور ستم ظریفی دیکھو کہ جہانگیر کو مست لایعقل کا خطاب دیتے ہیں۔ اور افسوس یہ ہے کہ ہمارا اُردو کا، انشا پرواز بھی (مولوی محمد حسین آزاد) قاضی نور اللہ شوستری کے خون کا انتقام اسی پردہ میں لیتا ہے،

جہانگیر کے دورہ کی حد ایک طرف آگرہ سے لیکر پنجاب۔ اور کشمیر تک اور دوسری

طرف مالوہ اور گجرات تک ہی! ان ممالک کے ضلاع اور شہروں بلکہ قصبات تک کے تمام حالات اس نے جس تحقیق سے لکھے ہیں۔ اس پر اضافہ نہیں ہو سکتا

علم الحیوانات

جہانگیر کے زمانے میں کسی کو اس فن کا خیال بھی نہ ہوگا۔ لیکن توزک جہانگیری میں اسکے متعلق اس قدر معلومات ملتے ہیں کہ اس علم کی ایک اچھی ابتدائی تصنیف اس سے طیار ہو سکتی ہی، شکار کا شوق۔ شاہی لوازم میں داخل ہی اور گو خشک مزاج عالمگیر اسکو "کار بیکاران" کے لقب سے یاد کرتا تھا لیکن خود بھی اکثر بیکار بن جاتا تھا۔ تاہم آجتک کسی نے اس سے یہ کام نہیں لیا کہ علم الحیوانات کی تدوین میں کام آئے! جہانگیر کو بھی شکار کا بے انتہا شوق تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنی شکار افگنی کا نقشہ طیار کرانا چاہا چونکہ دفتر میں ایک ایک چیز قلمبند کیجاتی تھی اسلیے تحقیقات سے ثابت ہوا کہ بارہ برس کی عمر یعنی ۹۸۸ھ ہجری سے پچاسویں سال تک ۲۸۵۳۲ جانور اسنے شکار میں مارے تھے، جن میں ۸۶ شیر تھے، توزک میں ایک ایک جانور کی الگ الگ تفصیل لکھی ہے،

وہ جس جانور کو مارتا تھا۔ فوراً اُسکا وزن اور تشریح کراتا تھا۔ اور یہ دیکھتا تھا کہ اس میں غیر معمولی کیا چیزیں ہیں مثلاً۔

گرگ نرے۔ میرزا رستم شکار کردہ بود۔ آوردہ۔ می خواستم کہ ملاحظہ نمایم کہ زہرۂ او بطریق زہرۂ شیر در درون جگر واقع ست۔ یا مانند جانوران دیگر دہ بیرون جگر دارد بعد از تفحص ظاہر شد کہ زہرۂ او ہم در درون جگر می باشد"

یکے از بزہائے نر را کہ از ہمہ کلان تر بود فرمودم کہ بہ وزن در آوردند وہ من و نیم دچہار سیر ظاہر شد۔ از گورخرہائے شکاری یکے کہ بہ جثہ از ہمہ قوی تر بود نہ من و شانزدہ سیر سنجیدہ شد،

مگر مچھ دیدہ شد کہ ہشت گز طول و یک گز عرض داشت،

نورجہان بیگم قسر یشۂ این جابہ بندوق زد کہ تا حال بہ آن کلانی وخوش رنگی دیدہ نہ شدہ بود۔ فرمودم وزن نمودند نوزدہ تولہ و پنچ ماشہ بوزن درآمد۔

درین تاریخ امانت خان دو دندان فیل گذرانید بغایت کلان کہ یکے ازان سہ ذرع دگز، و ہشت طسو طول و شانزدہ طسو ضخامت داشت سہ من و دو سیر بوزن درآمد؛

علم الحیوانات کی تصانیف میں سب سے مقدم یہ ہے کہ جس جانور کا ذکر کیا جائے اُس کی صورت شکل، ڈیل ڈول۔ خط وخال۔ رنگ وپ کا۔ اسطرح بیان کیا جائے کہ آنکھوں میں تصویر پھر جائے، حیوٰۃ الحیوان دمیری میں جو اِس فن کی سب سے عمدہ کتاب خیال کی جاتی ہے اکثر یہ نقص پایا جاتا ہے کہ دو جانور، جو باہم ملتے جلتے ہیں۔ انمیں امتیاز نہیں ہوسکتا، لیکن جہانگیر جس جانور کا ذکر کرتا ہے تصویر کھینچکر رکھ دیتا ہے اس سے اسکی قوت تحریر۔ اور قدرت زبان کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ولایتی مرغی کا ذکر اوپر گذر چکا ہے اسکو ایک بار اور پڑھو۔ ایک اور موقع پر ایک قسم کے بندر کا ذکر کرتا ہے؛

میمونے آوردہ بود بہ ہیئات غریب و شکل عجیب۔ دست و پا و گوش و سر او بعینہ میمون ست و روے او بروے روباہ می ماند۔ رنگ چشمہائے او بہ رنگ چشم باز۔ لیکن از چشم باز کلان تر ست از سر او تا سر دُم یک ذرع معمول بودہ است از میمون پست تر و از روباہ بلند تر است۔ رنگ او خاکستری ست۔ از بنا گوش تا زنخ سرخ است می گون۔ دُم او از نیم ذرع دو سہ انگشت دراز تر غایتہ بہ خلاف دیگر میمون ہا دُم این جانور افتادہ است؛

لیکن اس نے اِسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تمام کمیاب جانوروں کی تصویریں کھچوائیں اور تو زک جہانگیری میں شامل کیں چنانچہ اس کا ذکر مصوری کے بیان میں آئے گا۔

اکثر شکاروں میں جب کوئی غیر معمولی قد و قامت کا جانور شکار کرتا تھا تو اسکی تصویر کھچواتا تھا سنہ جلوس میں ایک نہایت مہیب شیر کا شکار کیا تو اسکی تصویر کھنچوائی چنانچہ خود لکھتا ہے،

از ایام شاہزادگی تا حال این ہمہ شیر کہ شکار کردم در بزرگی و شکوہ و تناسب اعضا مثل این شیرے بنظر نیامدہ بہ مصوران فرمودم کہ شبیہہ آن را موافق ترکیب و جثہ بکشند بست و نیم من جہانگیری وزن شد، (صفحہ ۲۷۵)

علم الحیوانات کے نتائج میں اس سے بہت مدد ملتی ہے کہ جانوروں کی نہایت غیر معمولی اقسام ڈھونڈھکر پیدا کیے جائیں کیونکہ اس سے جانوروں کی ماہیت اور جنس و نسل جو قرار پا چکی تھی بدل جاتی ہے۔ جہانگیر اسکا خاص خیال رکھتا ہے سفید رنگ کا چینہ بہت کم سنا گیا ہے۔ راجہ نرسنگھ دیو نے جب سنہ جلوس میں پیش کیا تو نہایت خوش ہوا۔ تو زک میں اسکا جہان ذکر کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ میں نے حسب ذیل جانور بالکل سفید دیکھے ہیں اور میرے چڑیا خانے میں موجود ہیں،

شاہین۔ باشہ۔ شکرا۔ کنجشک۔ کوا۔ بٹیر۔ تیتر۔ پودنہ۔ طاؤس۔ باز۔

جہانگیر کا جانور خانہ حقیقت میں ایک عجائب خانہ تھا۔ اسمیں ایسے بھی بہت سے جانور تھے جنکی خلقت غیر معمولی خلقت تھی۔ ان میں ایک بکرا تھا جو بقدر ایک پیالہ کے دودھ دیتا تھا۔[1]

سنہ ۹ جلوس میں ولایت زیر باد سے ایک پرند آیا جو طوطی کے مشابہ تھا۔ اسکی یہ عادت تھی کہ تمام رات الٹا لٹک کر چہچہے کرتا تھا جہانگیر اسکا حال ان الفاظ میں لکھتا ہے،

درین روزہا جانورے از ولایت زیر باد آوردہ بودند کہ رنگ اصل بدن او موافق بہ رنگ طوطی ست لیکن در جثہ از و کوچک ترست یکی از خصوصیات این جانور آن ست

[1] تو زک جہانگیری صفحہ ۴۰،

که تمام شب پائے خود را بر شاخ درختے یا چوبے کرا ورا بران نشانیده باشند۔ بند کرده
خود را سر نشیب ہی سازد و با خود زمزمه میکند۔ و چون روز شد بر بالائے آن شاخ درخت
می نشیند۔ آب مطلق نمی خورد و در طبیعت او کار زہر میکند۔

جہانگیر ان عجائبات کے بہم پہونچانے میں بے دریغ روپیہ صرف کرتا تھا۔ اور اُن اُمراسے نہایت خوش ہوتا تھا جو اس قسم کی چیزونکو بہم پہونچاتے تھے۔ اور روپیہ کا مطلق خیال نہیں کرتے تھے۔ مقرب خاں کو بندر کھمبات میں بھیجا تو تاکید کی کہ۔

به بندر گوه رفته نفایسے که دران جا بدست آید جهت سرکار خاصه شریفه خریداری نماید
حسب الحکم به استعداد تمام به گوه رفت و مدتے دران جا بوده نفایسے که دران بندر
بدست افتاد اصلا روے زر نه دید بهر قیمتے که فرنگیان خواستند زر داده گرفت
ازان جمله جانورے چند آورده بود بسیار عجیب و غریب چنانچه تا حال نه دیده بودم بلکه
نام او را کسے نه میدانست[1] الخ،

اسکے فیل خانہ میں ایک ہاتی تھا جسکا نام اس نے گجراج رکھا تھا۔ اس کا قد سات گز شرعی اور آٹھ انگل کا تھا،[2] (شرعی گز جیسا کہ خود جہانگیر نے تصریح کی ہے چوبیس انگل کا ہوتا ہے یعنی ایک ہاتھ سے کچھ کم)

علم الحیوانات کا نہایت اہم مسئلہ جانوروں کے خصایص طبعی کا علم ہے۔ یعنی کون سے افعال اور خصایص انکی فطرت میں داخل ہیں۔ اور کون سے ایسے ہیں جو تعلیم و تربیت سے بدل سکتے ہیں۔ اسپر بہت سے عملی نتایج موقوف ہیں۔ مثلاً ہاتھی ایک مفید اور ضروری جانور ہے لیکن اسکے خصایص میں یہ ہے کہ آبادی میں جفت نہیں ہوتا اس ضرورت سے ہمیشہ جنگل سے گرفتار کرنے پڑتے ہیں ورنہ اگر انکی نسل پھیل سکے تو نہایت آسانی ہو جائے،

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۱۰۵ × [2] تزک جہانگیری صفحہ ۱۳۴،

جہانگیر اس امر پر خاص توجہ رکھتا تھا۔ اور اسنے تجربہ سے ثابت کر دیا کہ بہت سی باتیں جو بعض جانوروں میں فطری سمجھی جاتی تھیں۔ تربیت کے اثر سے بدل سکتی ہیں شیر کی نسبت عام طور پر مشہور ہے کہ کبھی انسان سے رام نہیں ہوتا لیکن جہانگیر لکھتا ہے،

شیران بہ نوعے رام گشتہ اند کہ بے قید و بے زنجیر گلہ گلہ در میان مردم میگردند و ضرر ایشان بہ مردم نمی رسد،

یہ بھی مشہور ہے کہ شیر۔ چیتے۔ ہاتھی۔ آبادی میں بچے نہیں جنتے، اکبر نے ایک ہزار کے قریب چیتے جمع کئے تھے اور ان کو ایک جگہ رکھتا تھا کہ شاید جفت ہوں۔ لیکن کبھی نہ ہوئے۔ نر اور مادہ کھلے باغوں میں چھوڑوا دیے جب بھی الگ رہے۔ لیکن جہانگیر کے جانورخانے میں شیر اور چیتے دونوں نے بچے جنے۔ جہانگیر لکھتا ہے۔

مادہ شیرے آبستن شد۔ و بعد از سہ ماہ سہ بچہ زائید و این ہرگز نہ شدہ کہ شیر جنگلی بعد از گرفتاری بہ جفت خود جمع شدہ باشد، (صفحہ ۱۱۷)

ہاتھی کی نسبت لکھتا ہے،

شب یکشنبہ مادہ فیلے از فیل خانہ خاصہ در حضور من زائید۔ مکرر فرمودہ بودم کہ تحقیق مدت حمل نمایند آخر الامر ظاہر شد کہ بچہ مادہ یک سال و شش ماہ و بچہ نر نوزدہ ماہ در شکم مادر مے ماند۔ بخلاف تولد آدمی کہ اکثر بچہ از شکم مادر بہ سر فرومی آیند بچہ فیل اکثر بہ پا بر می آید (۱۳۰)

اسی طرح سارس۔ تدرو وغیرہ کے واقعات لکھے ہیں۔ ایک شیر کی نسبت لکھا ہے کہ ایک بکری سے اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ بغیر اسکے بسر نہیں کر سکتا تھا دونوں ایک پنجرہ میں رہتے تھے۔ چنانچہ لکھتا ہے،

شاہزادہ داور بخش بہ شیر نر پیشکش کرد کہ با بز اُلفت گرفتہ در یک قفس میباشد و بہ آن بُز نہایت محبت و اُلفت ظاہر مے سازد۔ بہ دستورے کہ حیوانات جفت مے شوند بُز را در آغوش گرفتہ حرکت مے کند۔ حکم کردند کہ آن بز را مخفی داشتند فریاد و اضطراب بسیار ظاہر ساخت (۳۹۹)

اس قسم کے اور بہت سے واقعات لکھے ہیں جو علم الحیوانات کیلئے کار آمد ہیں،

مصوری — عام خیال ہے کہ چونکہ اسلام نے تصویر کشی کو حرام کر دیا۔ اس لیے مسلمان اس فن میں کچھ ترقی نہ کر سکے۔ بلکہ اُن کے عہد میں یہ لطیف فن گویا مٹ گیا۔ ہمکو مذہبی مسئلہ سے بحث نہیں۔ لیکن تاریخی واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس فن میں کچھ کم ترقی نہیں کی۔ اور سلاطین اور اُمرائے اسلام اس فن کے ساتھ خاص شغف رکھتے تھے؛ اور جہانگیر تو گویا عاشق تھا۔ اسکی مہارت اس فن میں اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ ایک تصویر اگر مختلف مصوروں کے ہاتھ کی بنی ہوتی تھی تو وہ بتا دیتا تھا کہ کہاں تک کس کے ہاتھ کا کام ہے خود توزک میں لکھتا ہے،

اگر در یک صورت۔ چشم و ابرو را دیگرے کشیدہ باشد دران صورت می فہمم کہ اصل چہرہ کار کیست؟ و چشم و ابرو را کہ ساخت؟

اسکے دربار کا مصور ابو الحسن تھا جس کو جہانگیر نے ۱۳ جلوس میں نادر الزمانی کا خطاب دیا تھا خطاب دینے کی تقریب میں لکھتا ہے،

کار کش بہ عیار کامل رسیدہ و تصویر او از کارنامہائے روزگار ست درین عصر نظیر و عدیل خود ندارد۔ اگر درین روزگار اُستاد عبد الحی و اُستاد بہزاد در صفحہ روزگارے بودند انصاف کار او مے دادند۔ الحق نادرۂ زمان خود بودہ و ہمچنین اُستاد منصور نقاش کہ بہ خطاب نادر العصری ممتاز ست و در فن خود یگانۂ عصر خود ست (۲۳۵)

جہانگیر نے نہایت نادر نادر تصویریں اور مرقعے طیار کرائے تھے۔ سنہ ۱۴ جلوس میں خان عالم کو جب عراق بھیجا ہے تو کشن داس کو جو فن تصویر میں یکتائے روزگار تھا ساتھ بھیجا ہے کہ شاہ عباس صفوی اور اس کے ارکان سلطنت کی تصویر کھینچکر لائے، چنانچہ خود لکھتا ہے،

وقتیکہ خان عالم را بعراق می فرستادم بشندداس نام مصورے کہ در شبیہہ کشی از یکتایان روزگارست ہمراہ دادہ بودم کہ شبیہہ شاہ وعمدہائے دولت ایشان را کشیدہ بیارد شبیہہ اکثرے را کشیدہ بود بنظر در آورد خصوصاً شبیہہ شاہ برادرم (یعنی عباس صفوی) را بسیار خوب کشیدہ بود چنانچہ بہر کس از بندہائے ایشان نمودم عرض کردند کہ بسیار خوب کشیدہ (صفحہ ۲۸۵)

توزک کے شاہی نسخہ میں اپنے جلوس کا مرقع ابوالحسن نادرالزمانی سے طیار کرایا تھا جس کا اوپر ذکر گذر چکا ہے چنانچہ اسکے صلہ میں اس کو نادرالزمانی خطاب دیا تھا۔ جس قدر عجیب و غریب حیوانات وغیرہ اسکے عجائب خانے میں تھے سب کی تصویریں کھنچوا کر جہانگیر نامہ میں شامل کی تھیں چنانچہ خود لکھتا ہے،

حضرت فردوس مکانی (بابرشاہ) اگرچہ در واقعات خود صورت واشکال بعضے جانوران را نوشتہ اند لیکن غالباً بمصوران نفرمودہ اند کہ صورت آنہا را تصویر نمایند۔ چون این جانوران در نظر من بغایت غریب درآمدہ ہم نوشتم وہم جہانگیر نامہ فرمودم کہ مصوران شبیہہ آنہا کشیدند تا حیرتی کہ از شنیدن دست دہد از دیدن زیادہ گردد، (صفحہ ۱۰۵)

قدیم مرقعوں اور تصویروں کا نہایت شائق تھا۔ اور یہ شوق حد سے بڑھ گیا تھا امیر تیمور کے معرکہ جنگ کا مرقع ایک امیر نے ایران سے بہم پہنچایا تھا۔ اسکا ذکر توزک میں بطرح کیا ہے۔ اس سے اسکے شوق کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ مرقع خلیل مرزا

نے کھینچا تھا۔ اس مرقع میں ۴۴ تصویریں تھیں۔ اور یہ سب اُن شہزادوں اور اُمرا کی تصویریں تھیں جو اس معرکہ میں شریک جنگ تھے۔ ہر تصویر کے نیچے صاحب تصویر کا نام بھی لکھ دیا تھا، یہ مرقع شاہ اسمٰعیل صفوی کے کتب خانے سے شاہ عباس کے ہاتھ آیا تھا۔ شاہ عباس کے داروغہ کتب خانہ نے اسکو چوری سے بیچ ڈالا! اتفاق یہ کہ جہانگیر نے خان عالم کو جب ایران بھیجا تھا تو اصفہان میں یہ مرقع بازار میں بک رہا تھا۔ خان عالم نے خرید لیا۔ شاہ عباس کو خبر ہوئی تو خان عالم کو لکھ بھیجا کہ میں صرف دیکھنا چاہتا ہوں۔ بھیجدو! خان عالم نے بہت ٹالا۔ لیکن شاہ عباس کے اصرار سے مجبور ہو گیا اور آخر بھیجدیا! شاہ عباس کو چونکہ جہانگیر کی تصویر دوستی کا حال معلوم تھا۔ چند روز اپنے پاس رکھکر خان عالم کے پاس بھیجدیا۔ یہ تمام داستان جہانگیر نے توزک میں لکھی ہے۔ اور عجیب جوشش مسرت سے لکھی ہے ایک جگہ لکھتا ہے،

از نفائس و نوادر روزگار کہ خان عالم آوردہ الحق از تائیدات طالع او بود کہ چنین تحفہ بدست افتادہ مجلس جنگ صاحبقران ست اگر نام مصور نبودے گمان می شد کہ کار بہزاد باشد،

چون توجہ خاطر ما را بہ امثال این نفائس می دانند کہ در چہ مرتبہ است۔ از خاصتن نیز در کلی و جزوی بحمد اللہ کہ مضائقہ نیست۔ حقیقت را بہ خان عالم ظاہر ساختہ باز بر مشار الیہ لطف نمودند (صفحہ ۲۸۵)۔

اپنے زمانے کے نامور آدمیوں کے بت (اسٹیچو) بھی طیار کرائے تھے۔ اور تعجب یہ ہے کہ ان میں ہندو راجاؤں کے بُت بھی تھے۔ مہارانا اودے پور اور اُسکے بیٹے کرن کا جو بت طیار کرایا تھا۔ اسکے متعلق سال ۱۰ جلوس کے واقعات میں لکھتا ہے:

صورت رانا کرن پسر او را بہ سنگ تراشان تیز چنگ فرمودہ بودم کہ از سنگ مرمر

به قدم و ترکیبے که دارند تبراشند درین تاریخ صورت اتمام یافت و به نظر در آمد فرمودم که به آگره برده در باغ جهروکه درشن نصب کنند (صفحه ۱۶۲ و ۱۶۳)

جہانگیر تصویر شناسی کا جو دعوی کرتا ہے تذکروں اور تاریخوں سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے، سرخوش نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے ایک تصویر جہانگیر کو لا کر دی جس میں ایک عورت کی تصویر اس حالت میں کھنچی تھی کہ اسکی کنیز جھانویں سے اسکے تلوے مل رہی ہے۔ جہانگیر نے پانچہزار روپے دیکر وہ تصویر لی اس پر صاحب تصویر کو تعجب ہوا اور عرض کی کہ حضور اسمیں کیا بات ہی؟ جہانگیر نے کہا۔ جب تلوے سہلائے جاتے ہیں تو خفیف سی گدگدی پیدا ہوتی ہے۔ اسکا اثر چہرہ پر بھی ظاہر ہوتا ہے اور یہ اثر تصویر میں موجود ہے؛

صناعی اور صنعت گری جہانگیر کی خوش مذاقی اور قدردانی نے صناعی کو جسقدر ترقی دی اسکی تفصیل اس رسالہ میں سما نہیں سکتی، ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ جسکا ذکر جہانگیر نے سنہ ۶ جلوس کے واقعات میں استعجاب کے ساتھ کیا ہی۔ یہ پستہ کے چھلکے کے برابر ہاتی دانت کے چار مرقعے تھے۔ ایک میں چند پہلوان باہم لڑ رہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں نیزہ لئے کھڑا ہے دوسرے کے ہاتھ میں پتھر کا ٹکڑا ہے، ایک اور پہلوان زمین پر ہاتھ ٹیکے ہوئے بیٹھا ہے۔ سامنے ایک کمان ایک لکڑی اور ایک ظرف رکھا ہوا ہے۔ دوسرے مورقع میں ایک تخت ہی۔ جس پر ایک شامیانہ تنا ہوا ہی۔ تخت پر ایک بادشاہ پانوں پر پانوں رکھے ہوئے بیٹھا ہے۔ پیٹھ تکیہ سے لگی ہوئی ہے پانچ خدمتگار گرد و پیش کھڑے ہیں۔ اوپر سے ایک درخت کی شاخ بادشاہ کے سر پر سایہ کر رہی ہے۔ تیسرے مرقع میں نٹ تماشا دکھا رہے ہیں، ایک بلّی کھڑی ہی۔ اسمیں تین طنابیں بندھی ہیں۔ ایک نٹ اسطرح کھڑا ہے کہ بائیں ہاتھ کو سر کے پیچھے سے لاکر دائیں ہاتھ کو پکڑ لایا ہے۔ ایک ہاتھ میں ایک لکڑی ہے جس کے سرے پر ایک بکری

معلق ہے۔ ایک اور شخص گلے میں ڈھول ڈالے ہوئے بجا رہا ہے۔ ایک اور شخص ہاتھ اوپر اُٹھائے ہوئے کھڑا ہے۔ اور طناب کیطرف دیکھ رہا ہے۔ پانچ شخص اور اِدھر اُدھر کھڑے ہیں۔ چوتھے مرقع میں ایک درخت ہے۔ درخت کے نیچے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک آدمی ان کے پانون چوم رہا ہے۔ وہ ایک پیر مرد سے باتیں کر رہے ہیں۔ چار شخص اور آس پاس کھڑے ہیں؛

لطف یہ کہ یہ تمام تصویریں جو ہاتی دانت کی تھیں صرف ایک پستہ کے چھلکے میں آجاتی تھیں جہانگیر کو اِس صنعت گری پر اس قدر حیرت ہوئی کہ ان الفاظ میں اس کا ذکر کرتا ہے،

> یکے از غلامان بادشاہی کہ در خانم بندخانہ کار می کند۔ کارنامہ ساختہ نذر گذرانیدہ کہ تا امروز مثل این کار سے نہ شنیدہ بلکہ نشنیدہ ام۔ چون نہایت غرابت دارد بہ تفصیل نوشتہ می شود (توزک جہانگیری صفحہ ۹۷)

عبرت توزک جہانگیری۔ سر سید مرحوم نے علی گڈھ میں چھپوائی تھی۔ اس مرقع پر ایک حاشیہ لکھا ہے جسمیں تحریر فرماتے ہیں۔

> ظاہر این کارنامہ از غلام خاتم بندخانہ شاہی معلوم نمی شود چہ در مجلس چہارم ساختن صورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام را وجہے معلوم نمی شود۔ غالبا این کارنامہ از کارنامہاے کاریگران فرنگ بودہ و بہ دستش افتادہ۔ آن را از نام کارنامہ خود نذر گذرانید،

سید صاحب کو اسکا یقین نہیں آسکتا کہ کوئی ہندوستانی شخص بھی ایسا کمال دکھا سکتا ہے۔ اسلیے فرماتے ہیں کہ کسی یورپین نے بنائی ہوگی اور اسپر یہ قرینہ قائم کرتے ہیں کہ چوتھے مرقع میں حضرت عیسیٰ کی تصویر تھی۔ خوش اعتقادی کی یہ اخیر حد ہے۔ جس زمانے کا ذکر ہے اُسوقت یورپ یہ یورپ نہ تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ ہاتھ کی صناعیوں میں

آج بھی یورپ ایشیا سے بازی نہیں لیجا سکتا مسلمان۔ انبیائے بنی اسرائیل سے ایسے ناآشنا نہ تھے کہ حضرت عیسیٰ کی تصویر بنانا۔ ان کے لئے کوئی تعجب انگیز بات ہوتی۔ خصوصاً جب کہ اکبر نے عیسائیوں کو دربار میں دخل دیا تھا۔ اور حضرت عیسیٰ و مریم کی تصویریں بنانا عام ہو چکا تھا۔

تحقیقات اشیاء جہانگیر کو ہر چیز کی تحقیقات کا خاص شوق تھا جس ملک اور جس صوبہ میں جاتا تھا۔ وہاں کی ایک ایک چیز کی تحقیق کرتا تھا۔ ہر جگہ پرچہ نویس اور واقعہ نویس مقرر تھے کہ ملکی حالات کے ساتھ ہر قسم کی تحقیقات کی رپورٹ کرتے رہیں جو باتیں عام طرح سے مشہور ہو گئی تھیں اور لوگ انکو مسلمات عامہ کی طرح تسلیم کرتے آتے تھے جہانگیر انکی تحقیق کرتا تھا اور اکثر غلط ثابت ہوتی تھیں مثلاً عام طور پر مشہور ہے کہ مومیائی کے استعمال سے زخم فوراً اچھا ہو جاتا ہے جہانگیر نے اسکا تجربہ کیا اور نتیجہ تجربہ ان لفظوں میں لکھتا ہے!

در باب اثر مومیائی از حکیمان سخنان شنیدہ بودم۔ چون تجربہ شد ظاہر گشت نمی دانم کہ اطباء در اثر آن مبالغہ از حد گذرانیدہ اند یا بجہت کہنگی اثر آن گم شدہ باشد بہر تقدیر بروشے کہ قرار داد اطباء بود پائے مرغ را شکستہ زیادہ ازانچہ می گفتند خورانیدہ پارہ بر محل شکستگی مالیدہ شد و تا سہ روز محافظت نمودند حالانکہ مذکور می شد کہ از صباح تا شام کافی ست۔ بعد ازان دیدہ شد ہیچ گونہ اثرے ظاہر نشدہ (صفحہ ۱۱۶)

زعفران کا خندہ زا ہونا۔ عموماً مسلم ہے۔ چنانچہ ذخیرہ خوارزم شاہی میں جو طب کی معتبر کتاب ہے بتصریح مذکور ہے جہانگیر نے قید خانہ سے ایک قیدی کو بلا کر پاؤ سیر زعفران کھلا دی۔ کچھ اثر نہ ہوا۔ دوسرے دن آدھ سیر تک کھلائی حس تک نہ ہوئی۔

لہ تزک جہانگیری صفحہ ۳۵۶۔

ہُما جسکا سایہ مشہور ہے۔ جہانگیر نے اسکا پتہ لگایا تو اسقدر معلوم ہوا کہ پیر پنجال کے پہاڑوں میں ایک پرند ہوتا ہے جو ہڈیاں کھاتا ہے، جہانگیر نے حکم دیا کہ جو شخص شکار کر لائے ہزار روپیہ انعام پائیگا، چنانچہ جمال خان بندوق سے مار کر لایا۔ جہانگیر نے سینہ چاک کرا کے دیکھا تو چینہ دان میں ہڈی کے ریزے تھے[1]۔ اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے،

ہُمائے بر سرِ مرغان ازان شرف دارد — کہ استخوان خورد و ہیچکس نیازارد

چونکہ تمام ملک کو جہانگیر کے مذاق کا حال معلوم ہو گیا تھا اسلیئے ہر جگہ سے اسکو مفید اطلاعیں پہونچتی تھیں،

آسمان سے جو ستارے ٹوٹ کر گرتے ہیں عوام تو خدا جانے اسکے متعلق کیا کیا کہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ستارے کبھی کبھی باہم ٹکرا کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ تصادم کے وقت ان سے روشنی نکلتی ہے ان کے اجزا زمین تک بھی آجاتے ہیں جہانگیر کے زمانے میں ایکدفعہ جالندھر کے مضافات میں بڑے زور کی آواز آئی۔ ساتھ ہی آسمان سے بجلی سی گری۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ آگ برس رہی ہے۔ دس بارہ گز تک زمین بالکل جلکر سیاہ ہو گئی تھی۔ زمین کو کھودا گیا تو لوہے کا ایک ٹکڑا نکلا جو سخت گرم تھا، جب ٹھنڈا ہوا تو پرگنہ کے حاکم نے خریطہ میں رکھکر جہانگیر کے[2] پاس بھیجا۔ جہانگیر نے اُستاد داؤد کو حکم دیا کہ اسکی تلوار بنا کر لائے۔ معلوم ہوا کہ گھن پڑنے سے چور ہو جاتا ہے۔ جہانگیر نے حکم دیا کہ لوہا بھی اسمیں ملا دیا جائے چنانچہ چوتھائی حصہ لوہا ملا کر دو تلواریں اور خنجر وغیرہ طیار ہوئے جنمیں یمنی تلواروں کا سا دم خم تھا۔ جہانگیر نے سامنے تجربہ کرایا تو تلواروں نے خوب کاٹ کیا۔ بیدل خان نے یہ رباعی لکھی،

از شاہ جہانگیر جہاں یافت نظام — افتاد بہ عہدش از برق۔ آہن خام

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۳۱۰ [2] صفحہ ۲۳۰ تزک جہانگیری

زان آہن ست بہ حکم عالمگیرش یک خنجر و کارد و با دو شمشیر تمام

جہانگیر کی دقت نظری اور موشگافی اس حد تک تھی کہ مصنوعی اور مشتبہ چیزیں گو کتنی ہی نظر فریب ہوں اسکو دھوکا نہیں دیسکتی تھیں۔ بارہا لوگوں نے بڑے بڑے عجیب و غریب مرقعے اور تصویریں وغیرہ اسکے سامنے پیش کیں لیکن اسنے ظاہر فریبی پر اعتبار نہیں کیا۔ سنہ ۳ جلوس میں مقرب خان نے ایک تصویر بھیجی جو یورپ سے ہاتھ آئی تھی اور جسکی نسبت روایت تھی کہ تیمور کی اُسوقت کی تصویر ہے جب اُسنے سلطان بایزید بلدرم کو گرفتار کیا تھا۔ اسوقت قسطنطینیہ میں عیسائی حکومت تھی وہاں کے فرماں روا نے تیمور کے پاس سفارت بھیجی۔ سفیر کے ساتھ مصور بھی آیا تھا یہ تصویر اُسنے کھینچی تھی جہانگیر اس واقعہ کو لکھکر لکھتا ہے،

اگر این دعوی اصلی داشتہ باشد ہیچ چیز تحفہ پیش من بہتر ازین نخواہد

چون بصورت و حلیہ اولاد و فرزندان سلسلہ علیہ آن حضرت مشابہتے ندارد خاطر

بر راست بودن این سخن تسلی نمی شود[۱]۔

جہانگیر کو اس تحقیقات کا خاص شوق تھا کہ ہر چیز کس حد تک معمولی حالت سے زیادہ ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اسنے اکثر درختوں۔ پھلوں۔ جانوروں وغیرہ سے متعلق اس قسم کی تحقیقات کرائیں۔ مثلاً انار کی نسبت ثابت ہوا کہ ۴۰ تولہ تک ہوتا ہے۔ بہی ۲۹ تولہ تک۔ یہ دونوں پھل فراہ سے آئے تھے اور اُسنے وزن کراکر دیکھا تھا[۲]۔ فتحپور سے ایک تربوز آیا جو وزن کرنے پر ۳۳ سیر کا ٹھہرا۔ سنہ ۱۱ جلوس میں جب شیخوپور پہونچا تو بڑ کا ایک درخت غیر معمولی قد و قامت کا نظر آیا۔ اسکی پیمائش کرائی معلوم ہوا کہ اسکے تنہ کا دور اٹھارہ گز اور جڑ سے شاخ تک کی بلندی ۱۲۸[۳] گز۔ اور جتنا میں جو زمین گیر ہوکر درخت بنگئی ہیں ۲۰۳ گز ہیں۔ ایک شاخ جو ہاتی کے دانت کیطرح سامنے نکلی

---

[۱] توزک جہانگیری صفحہ ۷۰، [۲] توزک جہانگیری ۲۱۱، [۳] توزک جہانگیری ۱۷۹،

ہوئی تھی ۸ہ گز تھی۔ اِسی سنہ میں خرمے کا ایک عجیب و غریب درخت نظر سے گذرا ۶۰ گز اونچا اوپر جاکر دو شاخیں ہوگئی تھیں۔ اور ہر شاخ دس دس گز کی تھی۔ جہانگیر نے مصوروں سے اسکی تصویر کھچوا کر جہانگیر نامہ میں درج کرائیں[۵۱]۔ اس قسم کے سیکڑوں واقعات ہیں جنکی تفصیل یہاں نہیں ہوسکتی،

سپہ گری کو مذاق

تمام انگریزی مورخوں اور اُنکے مقلدوں نے جہانگیر کو جس عینک سے دیکھا ہے اُس سے وہ ایک مست الست عیاش نظر آتا ہے۔ لیکن تاریخی نگاہ پہلے ہی نظر میں پہچان سکتی ہے کہ یہ وہی تیمور کا پوتا اور اکبر اعظم کا بیٹا ہے وہ نورجہاں بیگم سے اتنی بات پر برہم ہوگیا اور مدتوں اُس سے بات نہ کی کہ وہ دفعتہً شیر کے خیمہ میں آجانے سے بھاگ گئی تھی[۵۲]۔ مہابت خان سپہ سالار نے جب باغی ہوکر سات ہزار راجپوتوں سے دفعتہً اسکا محاصرہ کرلیا۔ اور وہ بالکل تنہا رہ گیا۔ تو بار بار تلوار کے قبضہ پر ہات ڈالتا تھا کہ اُس کا سر اُڑا دے لیکن مشیر نے روکا کہ یہ تحمل اور بلند حوصلگی کا وقت ہے۔ ایک دفعہ شیر کو اس نے بندوق کے کندے سے مار کر گرا دیا چنانچہ اس کا حال خود لکھتا ہے،

شیر از شدت غضب از جا برخاستہ بہ قفاے فیل برآمد و فرصت مقتضی آن نہ شد کہ بندوق را گذشتہ شمشیر را بکار فرمایم سر بندوق را گردانیدہ بہ زانو در آمدم و بہ دو دست سر بندوق را چنان بر سر و روی او زدم کہ از اسیب آن برزمین اُفتاد و جان داد[۵۳]،

بھیڑیا۔ بیس بیس تیس تیس تیر کھاکر بھی نہیں مرتا۔ جہانگیر نے ایک ایک تیر میں مارا ہے۔ چنانچہ اسکا تذکرہ فخر کے لہجے میں کیا ہے۔ لیکن بالآخر شرما کر کہتا ہے کہ اپنے

---

۵۱ تزک جہانگیری صفحہ ۱۴۸، ۵۲ اِس واقعہ کو مآثرالامرا میں بہ تفصیل لکھا ہے۔

۵۳ تزک جہانگیری صفحہ ۲۶۷،

منہ سے اپنے واقعات کیا بیان کروں، اسلیئے اسی ایک واقعہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

گرگے از پیش برآمد، تیرے نزدیک بہ بناگوشش زدم کہ قریب بہ یک وجب فرو نشست و بہ ہمان تیر افتاد و جان داد۔ و بسیارے بودہ کہ پیش من جوانان سخت کمان بیست تیر و سی تیر زدہ اندو نہ مردہ، چون از خود نوشتن خوشنما نیست زبان قلم را از عرض این وقائع کوتاہ می دارم[1]،

باوجود اسکے کہ اسکا زمانہ شاہانہ نازونعمت کا اوج شباب تھا۔ اور زمین و آسمان راحت وآرام کے گہوارے بن گئے تھے تاہم اس میں وہی سپاہیانہ جفاکشی اور محنت کے انداز موجود تھے جو اسکے اسلاف کے جوہر تھے۔ دریا میں جال لیکر اُترنا اور مچھلی کا شکار کرنا۔ ماہی گیروں کے سوا کون کرسکتا ہے لیکن جہانگیر کو باین شاہنشاہی اس سے عار نہیں اور شوقیہ کرتا ہے چنانچہ خود لکھتا ہے،

تا حال سترہ دام کہ از دامہائے مقرر است و بہ زبان ہندی بھنور میگویند انداختہ بودم۔ انداختن آن خالی از اشکالی نیست۔ بہ دست خود این دام را انداختہ دہ دوازدہ ماہی گرفتم و مروارید از بینی آن کشیدہ بہ آب سر دادم،

ایک دفعہ باغ میں مجلس آراستہ تھی۔ باغ میں ایک نہر تھی جسکا پاٹ ۸ گز کا تھا سب کو حکم دیا کہ اسکو پھاندیں۔ اکثر لوگ بیچ میں رہ گئے جہانگیر نکل گیا تاہم لکھتا ہے!

من ہم اگرچہ جستم اما آن چستی کہ در سی سالگی جستہ بودم درین ایام کہ عمر من بہ چہل سالگی رسیدہ آن قدرت و چالاکی نتوانستم جست[2]۔

کابل میں سات باغ۔ دور دور فاصلہ پر ہیں۔ ان سب کی ایک ہی دن میں پاپیادہ سیر کی۔ درختوں پر خود چڑھ کر پھل توڑتا تھا اور لکھتا ہے کہ اسطرح پھل کھانے میں خاص لطف ہے،

---

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۲۶۷، [2] تزک جہانگیری صفحہ ۱۰۱۔

شمشیر بازی کا فن مرتضیٰ خان دکنی سے سیکھا تھا جو اس فن میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ سنہ جلوس میں اسکو وزش خان کا خطاب دیا؛

ایشیائی سلطنتوں کا عام قاعدہ ہے کہ بادشاہ کا مذاق تمام ملک میں سرایت کرجاتا ہے۔ اور تمام لوگوں میں وہی خصائل پیدا ہوجاتے ہیں جو خود بادشاہ میں ہوتے ہیں۔ جہانگیر کے زمانے میں سپہگری اور بہادری کا مذاق اس قدر عام ہوگیا تھا۔ لوگ شیروں سے لپٹ جاتے تھے اور دست بدست لڑتے تھے سنہ جلوس میں جب ایک شیر دفعۃً جہانگیر پر آپڑا۔ تو انوپ رائے بڑھکر شیر سے مقابل ہوا۔ چنانچہ اسکی کیفیت جہانگیر ان الفاظ میں لکھتا ہے،

انوپ رائے سہ پایہ را از دست گذاشتہ بہ شیر متوجہ شد۔ شیر بہمان چستی و چالاکی کہ حملہ آور گشتہ بود بر وے برگشت وا و مردانہ بہ شیر روبرو شد آن چوب کہ در دست داشت بہ ہر دو دست دو بار بر سر او محکم فرود کوفت شیر دہن باز کردہ ہر دو دست انوپ را بہ دہن گرفت۔ انوپ رائے زور کردہ دستہائے خود را از دہن شیر برآورد و دو سہ مشت بر کلا او میزند و بہ پہلو غلطیدہ بزور زانو راست می ایستد۔ در رنگ کشتی گیر بر یکدیگر پیچیدہ غلطان شدند الخ۔

سنہ جلوس میں چوروں نے شاہی خزانہ پر چھاپا مارا۔ چند روز کے بعد انکا پتہ لگا اور گرفتار ہوگئے۔ جہانگیر نے انکے سردار کی نسبت حکم دیا کہ ہاتی کے پانوں میں ڈال دیا جائے۔ اُسنے عرض کی کہ حکم ہو تو میں ہاتی سے لڑسکتا ہوں۔ جہانگیر نے اجازت دی۔ وہ خنجر لیکر بڑھا۔ ہاتی نے چند دفعہ اس کو اُٹھا کر پٹک پٹک دیا۔ لیکن وہ ہر بار بڑھکر ہاتی پر حملہ آور ہوتا تھا یہان تک کہ ہاتی کو پھر اسکی طرف بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

نور جہان بیگم کا شیر مارنا سب جانتے ہیں۔ لیکن اسنے یہ مشق جہانگیر کی نار اضی

سلہ توزک جہانگیری صفحہ ، سلہ توزک جہانگیری صفحہ ۹۰،

سے بعد پیدا کی تھی؛

دادرسی۔ رعایا کی خبر گیری اور جفاکشی

مخالفین تو کہتے ہیں کہ جہانگیر کا شراب وکباب کے سوا۔ اور کچھ کام نہ تھا لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ رعایا کی دادرسی عدل وانصاف ملک کی خبر گیری میں اکبر کے سوا۔ کوئی اسکا جواب نہ تھا۔ اس دعوی کا ثبوت تفصیل اور وسعت کے ساتھ تو اور تاریخوں سے ہو سکتا ہے لیکن ہمارے مضمون کا عنوان توزک جہانگیری تک محدود ہے یعنی جو واقعات خود توزک جہانگیری سے ثابت ہوں۔ اُن سے تجاوز نہ کیا جائے اس لیئے ہم اس دائرہ سے باہر نہیں جانا چاہتے،

جہانگیر اپنے نامور باپ کی طرح دن رات میں صرف تین گھنٹہ سوتا تھا۔ چنانچہ خود لکھتا[۱] ہے،

به کرم الٰہی عادت چنان شده که در میان شبان روزے بیش از دو سه ساعت نجومی نقد وقت به تاراج خواب نمی رفت۔ و درین ضمن دو فائده منظور ست یکے آگاہی از ملک و دوم بیدار دلی به یاد حق[۲]۔

احمد آباد گجرات کی آب وہوا اسکو نہایت ناموافق آئی تاہم جبتک وہاں رہا عین گرمی اور حدت کے وقت۔ دوپہر کے بعد کھلے میدان میں دربار عام کرتا تھا اور حکم تھا کہ نقیب اور چوبدار وغیرہ بالکل ہٹا دیے جائیں کہ کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہو۔ چنانچہ لکھتا ہے،

چون مردم این شہر بغایت ضعیف دل وعاجز اند به جہت احتیاد کہ مبادا بعضے از اہل اُردو به تعدی وستم در خانہ ہائے آنہا فرود آیند۔ وقاضی ومیر عدل به جہت بردہ دیدگی (رعایت ۱۲) مداہنت نمایند۔ از تاریخی که درین شہر نزول سعادت اتفاق اُفتاد باوجود حدت وحرارت ہوا ہر روز بعد از فراغ عبادت دوپہر به جھروکہ کہ طرف دریا کہ ہیچگونہ حائلے و

[۱] توزک جہانگیری صفحہ ۱۶۷ [۲] توزک جہانگیری صفحہ ۲۳۳۔

وما لغے از در و دیوار و لیادل و چوبدار نہ دار د بر آمدہ و سہ ساعت نجومی می نشینم و بہ مقتضائے عدالت بہ فریاد داد خواہان رسیدہ ستم پیشہ ہا را در خور جرایم و تقصیرات سیاست می فرمایم حتی در ایام ضعف باکمال درد الم بہ دستور معہود بہ جھروکہ بر آمدہ تن آسانی بر خود حرام داشتہ ام[1]۔

یہ امر تمام مورخین نے تسلیم کیا ہے کہ عدل و انصاف میں جہانگیر بالکل بے لاگ تھا۔ اِس معاملہ میں اسکے نزدیک دربار کا ایک رکن اعظم اور ایک غریب مزدور دونوں برابر تھے۔ اخیر میں نور جہان اسکے مزاج پر بالکل حاوی ہو گئی تھی۔ تاہم جیسا کہ صاحب مآثر الامرا نے بھی تسلیم کیا ہے اس نے نور جہان سے کہدیا تھا کہ سلطنت تمھاری ہے لیکن مظلوموں کے مقابلہ میں خبردار کسی کی سعی سفارش نہ کرنا جو کبھی میرے سامنے پیش نہ جا سکے گی مقرب خان سے بڑھکر کوئی معتمد نہ تھا۔ اس کے ساتھ وہ دربار اور سلطنت کا رکن اعظم تھا۔ تاہم جب ایک بڑھیا بیوہ نے اسکی شکایت کی تو بڑی سختی سے تحقیقات کی اور مقرب خان کے نوکر کو جو جرم کا مرتکب ہوا تھا۔ قتل کرا کے مقرب خان کا منصب گھٹا دیا[2]۔ اِس بارے میں اس کے واقعات تعجب انگیز داستان بن گئے ہیں اور گو ہمنے توزک جہانگیری کا التزام کیا ہے لیکن صرف ایک واقعہ ایک دوسری کتاب کی سند سے لکھتے ہیں،

ایک دفعہ نور جہان بیگم مہتابی پر ٹہل رہی تھی۔ اتفاق سے کوئی راہرو اُدھر سے گذرا۔ اور اس نے نظر اُٹھا کر نور جہان کیطرف دیکھا نور جہان نے اسکو گولی ماردی جہانگیر کو خبر پہونچی۔ فوراً حکم دیا کہ تحقیقات کی جائے۔ جرم ثابت ہوا اور قاضی نے قصاص کا فتویٰ دیا۔ قلما قنوں کو حکم ہوا کہ محل میں جاکر نور جہاں کو پکڑ لائیں اور جلاد کے حوالے کردیں۔ نور جہاں نے بہت کچھ روپیہ کا لالچ دیا لیکن سب جہانگیر کی

---

[1] توزک جہانگیری صفحہ ۲۲۲، [2] توزک جہانگیری صفحہ ۸۴،

انصاف پرستی سے واقف تھے کسی سے کچھ نہ سُنی۔ بالآخر نورجہاں نے مقتول کے ورثہ کو راضی کیا کہ خون بہا لیں چنانچہ دو لاکھ روپیہ خونبہا لیکر اُن لوگوں نے دست برداری کی۔ اور جہانگیر سے کہہ دیا کہ ہمکو کچھ دعوےٰ نہیں۔ جہانگیر نے کہا شاید تم لوگوں پر بیگم کی طرف سے کچھ دباؤ پڑا۔ ان لوگوں نے یقین دلایا کہ نہیں ہمنے بخوشی ایسا کیا ہے۔ جہانگیر نے رہائی کا حکم دیا۔ یہ سب کچھ ہو چکا تو محل میں گیا اور عشق کی ادا دیکھو! نورجہاں کے پانوں پر گرکر کہا ہائے بیگم اگر ترا می کشتند من چہ می کردم [۱]۔

جہانگیر کی پالیسی اکبر اور جہانگیر کی پالیسیاں گو متحد المقصد تھیں لیکن ایک نہایت اہم فرق تھا۔ اس امر میں دونوں متفق تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے حقوق یکساں ہیں اور دونوں پر یکساں حکومت کرنا فرض سلطنت ہے۔ لیکن اکبر کا خیال تھا کہ اس مقصد کے لئے مذہبی جوش اور اثر کا رنگ ہلکا کرنا ضرور ہے۔ اسلئے وہ ہندو عیسائی۔ پارسی تمام۔ مذہبوں کا ظاہری قالب اختیار کرتا رہتا تھا۔ وہ صبح کو سورج پر پانی چڑھاتا تھا۔ شام کو چراغ کی تعظیم کرتا تھا۔ حضرت عیسیٰ اور مریم کی تصویروں کے آگے سر جھکاتا تھا لیکن جہانگیر سمجھتا تھا کہ پکا مسلمان پکا متعصب پکا دیندار رہ کر بھی غیر مذہب والوں کو مسلمانوں کے برابر حقوق دیئے جاسکتے ہیں۔ اسی بناپر وہ ایک طرف تو پنڈتوں سے مذہبی مباحثہ کرکے اِن کو قایل کرتا ہے [۲]۔ ایک ہندو راجہ روز افزون کو ہدایت وتلقین سے نہ بہ جبر مسلمان کرتا ہے [۳]۔ کوٹ کانگڑہ فتح کرکے اسلامی شعار جاری کرتا ہے اور اس پر ناز کرتا ہے دوسری طرف راجہ مان سنگھ کو بنگالہ کا گورنر کرکے

---

۱ اس واقعہ پر لوگونکو یقین کرنا مشکل ہوگا لیکن والہ داغستانی نے بہ تفصیل تمام اسکو ریاض الشعراء حالات جہانگیر میں لکھا ہے۔ والہ داغستانی شیعہ تھا۔ اور قاضی نوراللہ شوستری کے خون کا اسکو داغ تھا اسلئے اسکی شہادت بیکار نہیں ہوسکتی

۲ توزک جہانگیری صفحہ ۱۴۰ ۳ توزک جہانگیری صفحہ ۱۴۵

۵۰ ہزار فوج کا افسر مقرر کرتا ہے راجہ جگناتھ کو پنجہزاری منصب کے ساتھ خلعت اور مرصع تلوار عنایت کرتا ہے رانا شنکر کو جو مہارانا اودی پور کا برادر حرم زاد تھا خلعت دیکر۔ اودی پور کی مہم پر بھیجتا ہے بیرداس کو بکرماجیت کا خطاب اور میر آتشی کا عہدہ دے کر ۵۰ ہزار توپچیوں کا افسر کرتا ہے۔ شیخ عبدالحق دہلوی کی جس طرح تعظیم و تکریم کرتا ہے جدروپ گسائیں کے ساتھ بھی اسی اعزاز و خلوص اور احترام کے ساتھ پیش آتا ہے۔

اسکی تمام تاریخ میں ایک واقعہ بھی منقول نہیں کہ اسنے مذہب کی بنا پر ملکی حقوق میں کوئی تفریق کی ہو۔ اسنے اکبر کی پالیسی کی اِن لفظوں میں مداحی کی ہے اور اس حد تک خود اسکا پیرو تھا؛

بہ مقتضای آن کہ سایہ می باید کہ پر تو ذات باشد در ممالک محروسہ اش کہ ہر حدی بہ کنار دریای شور منتہی گشت۔ ارباب ملتہای مختلف و عقیدتہائے صحیح و ناقص را جا بودہ راہ تعرض بستہ گشتہ سنی باشیعہ در یک مسجد و فرنگی با یہودی در یک کلیسا طریق عبادت می سپرند[۱]

ع زمین عشق بہ کونین صلح کل کردم،

ہندوؤں سے اصلی تعلقات اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ تیموریوں کے تعلقات در اصل ہندوؤں کے ساتھ کیا تھے؟ تو ملکی تاریخوں سے لوگوں کو تسلی نہیں ہوتی۔ ایک بدگمان معترض کہہ سکتا ہے۔ بلکہ کہتا ہے کہ تیموریوں نے ہندوؤں کو تمام ملکی حقوق دیے۔ ہر قسم کے عہدے عطا کیے قتل و قصاص میں کوئی تفریق نہیں کی، تاہم جو کچھ تھا مجبورانہ پالیسی تھی۔ تیموری جانتے تھے کہ مٹھی بھر مسلمانوں سے اتنے بڑے وسیع ملک پر حکمرانی نہیں کی جا سکتی اسلیے وہ مصلحۃً ہندوؤں سے دست و بازو کا کام لیتے تھے،

لیکن توزک جہانگیری اس مشکل کو بھی حل کر سکتی ہے جہانگیر اکثر ملکی دربار چھوڑ کر

سلہ توزک جہانگیری صفحہ ۵۹، سلہ توزک جہانگیری صفحہ ۱۱۶

گھر میں آبیٹھتا ہے اور اس وقت خانگی زندگی اور دلی جذبات کا آئینہ بنجاتا ہے۔ اس حالت میں وہ جو کچھ ہے اور جیسا کچھ ہے بے پردہ نظر آتا ہے، ہندو رانیاں تیموریوں کے گھر میں آئیں۔ اور حرم بنیں۔ ہم پتا لگانا چاہتے ہیں کہ یہ بھی زور حکومت کی ایک شان تھی اور رانیاں درحقیقت لونڈیاں بن کر رہیں اور اُنسے وہی ظاہری رواداری کا برتاؤ تھا یا یہ رانیاں تیموریوں کی عزیز تر بیویاں اور محبوب سی محبوب مائیں بن گئیں۔ جہانگیر کی ایک بیوی راجہ مان سنگھ کی بہن تھی خسرو اسی سے پیدا ہوا تھا۔ اور چونکہ اسکا ماموں راجہ مان سنگھ اور خسر خاں کوکلتاش تھا۔ اسلیے اسکو اکبر ہی کے زمانے میں خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جہانگیر کے بجائے تخت سلطنت مجھکو ملنا چاہیے چنانچہ ہمیشہ باپ سے آمادۂ بغاوت رہتا تھا۔ لیکن اسکی ماں اسکو ہمیشہ اس خیال سے باز رکھتی تھی خسرو نہیں مانتا تھا اور ماں کی کوفت بڑھتی جاتی تھی یہانتک کہ اس صدمہ سے اسنے افیون کھاکر جان دیدی جہانگیر لکھتا ہے،

از خوبی ہا و نیکی ہائی او چہ نویسم عقلے بکمال داشت و اخلاص او بمن دو مرتبہ بود کہ ہزار پسر برادر را قربان یک موئے من میکرد۔ مکرر بہ خسرو مقدمات نوشت و اورا دلالت بہ اخلاص و محبت من میکرد چون دید کہ ہیچ فائدہ ندارد از غیرتے کہ لازمۂ طبیعت راجپوتانی ہست خاطر بر مرگ خود قرار دادہ روز بیست و ششم ذیحجہ سنہ ۱۰۱۳ ہجری افیون بسیار در عین سوزش دماغ خوردہ در اندک زمانے در گذشت[1]،

رانی نے تو محبت شوہری کا یہ ثبوت دیا جہانگیر کا جو حال ہوا۔ وہ اسی کی زبان سے سننا چاہیے

از فوت او بنا بر تعلقے کہ داشتم ایامے بمن گذشت کہ از حیات و زندگانی خود ہیچ گونہ لذتے نیافتم چہار شبانہ روز کہ سی و دو پہر باشد از غایت کلفت و اندوہ چیزے از ماکولات و مشروب دار دطبیعت نگشت چون این قصہ بہ الد بزرگوارم رسید و نامہ از غایت

---

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۱۶۔

شفقت و مرحمت بدین مرید فدوی صادر گشت وخلعت و دستار مبارک از سر برداشته بودند ہمان طور بستہ بہ جہت من فرستادند این عنایت آبے بر آتش سوز و گداز من زد اضطراب بے اضطرار مرا فے الجملہ قرار و آرامے بخشید[1]

غور کرو اس واقعہ میں چار شبانہ روز کا فاقہ۔ دل کا کسی طرح قرار نہ پانا۔ اکبر کا یہ حالت دیکھ کر نہایت درد آمیز تسلی نامہ لکھنا اور اپنے سر سے پگڑی اُتار کر بھیجنا۔ ایسی چیزیں ہیں جو بناوٹ سے پیدا ہو سکتی ہیں؟ بے شبہ تیموریوں نے ہندوؤں کے ملک کو نہیں بلکہ دل کو فتح کر لیا تھا۔ اور ہندوؤں کے اخلاص و محبت نے فاتح کو مفتوح بنا لیا تھا،

بہ لوح مشہد پروانہ این رقم دیدم　　　کہ آتشے کہ مرا سوخت۔ خویش را ہم سوخت

علما اور فقرا کی قدردانی

ایشیائی سلطنتوں میں علم و فضل کا رواج۔ سلاطین کی قدردانی موقوف ہے اور اس باب میں سلاطین اسلام کو عموماً تمام دنیا کے حکمرانوں پر ترجیح ہی جہانگیر بھی علمی قدردانی میں اسلاف کی ایک عمدہ مثال تھا وہ ہر مذہب کے علما اور فقرا سے ملتا تھا، اور اِن کے ساتھ برتاؤ میں تمام آداب شاہی کو بھول جاتا تھا۔ اسکے ساتھ چونکہ نکتہ شناس تھا اسلیئے ہر شخص کی نسبت ایسی رائے ظاہر کرتا ہے جو ایک بڑے مدقق کا کام ہو سکتا ہی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی نسبت لکھتا ہے۔

مدت ہاست کہ در گوشۂ دہلی بہ وضع توکل و تجرید بسر می برد۔ مرد گرامی ست صحبتش بے ذوق نیست۔ بہ انواع مراحم دلنوازی کردہ رخصت فرمودم[2]،

شیخ موصوف کی تصنیفات میں سے تذکرہ اولیائے ہند کا ذکر کیا ہی اور اسکی نسبت لکھتا ہی،

دو کتابے تصنیف نمودہ بود مشتمل بر احوال مشائخ ہند بہ نظر در آمدہ خیلے زحمت کشیدہ،،

میر عضدالدولہ نے جب فرہنگ جہانگیری پیش کی ہی تو اس کی نسبت لکھتا ہی

الحق محنت بسیار کشیدہ و خوب پیروی ساختہ و جمیع لغات را از اشعار علما قدما مستشہد

---

[1] توزک جہانگیری صفحہ ۲۸۲، [2] توزک جہانگیری صفحہ ۳۴۹،

آوردہ دریں فن کتاب بے مثل این نمی باشد فیل خاصہ عنایت[1] نمودم۔

فارسی کا ایک محقق۔ اس کتاب کی نسبت اس سے بڑھکر محققانہ کیا رائے دیسکتا ہی؛ فارسی لغت میں جس قدر کتابیں اسوقت تک لکھی گئی تھیں کسی میں قدما کے اشعار سے سند لانے کا التزام نہ تھا۔ اور فرہنگ جہانگیری کا یہی امتیازی وصف ہی؛

یاد ہوگا کہ فیضی جب اکبر کے دربار میں آیا ہی تو جہانگیر اور مراد کی تعلیم پر مقرر ہوا چنانچہ خود لکھتا ہے، ع

ہیکے معلمے شاہزادہائے عظام

جہانگیر کی علمی قابلیت تصدیق کرتی ہے کہ فیضی نے اپنا فرض نہایت کامیابی کے ساتھ ادا کیا۔ خان خاناں بھی جہانگیر کا اتالیق رہ چکا ہے۔ ایسے اُستادوں سے فیض تعلیم سے ہم۔ ایسے ہی نتیجہ کی توقع رکھ سکتے تھے؛

جہانگیر کا استفادہ علمائے اسلام تک محدود نہ تھا۔ وہ ہندو پنڈتوں اور درویشوں کے ساتھ بھی اسی خلوص اور عقیدت سے پیش آتا ہے۔ اسکے زمانے میں جدروپ سناسی ایک مرتاض درویش تھا وہ پہاڑ کی کھوہ میں ایک نہایت دشوار گذار بھٹ میں رہتا تھا جہانگیر بارہا اسکی خدمت میں گیا اور اس سے علمی صحبتیں رہیں۔ وہ جدروپ کا جب ذکر کرتا ہے تو عقیدت مندی اور محبت سے لبریز نظر آتا ہے۔ چونکہ اسکی جائے قیام تک سواری نہیں جاسکتی تھی۔ قریب تین میل کے پیادہ چل کر وہاں پہونچا ہی چھ گھنٹے تک اسکی صحبت میں رہا۔ چنانچہ ملاقات کا حال تفصیل سے لکھ کر لکھتا ہی،

علم بیدانت راکہ علم تصوف باشد خوب ورزیدہ۔ تاشش گھڑی باو صحبت داشتم سخنان خوب مذکور ساخت چنانچہ خیلے در من اثر کرد۔[1]

داستان عہد گل را از نظیری می شنو   عندلیب آشفتہ تر گفت است این افسانہ را

---

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۱۷۶۔

مجددان اسلام

علامہ ابن تیمیہ حرانی

اسلام میں سیکڑوں، ہزاروں، بلکہ لاکھوں، علما، فضلا، مجتہدین، ائمہ فن، اور مدبرین ملک گذرے، لیکن مجدد یعنی رفارمر بہت کم پیدا ہوئے ایک حدیث ہی کہ ہر صدی میں ایک مجدد پیدا ہوگا، اگر یہ حدیث مان لیجائے تو آج تک کم از کم ۱۳ مجدد پیدا ہونے چاہئیں، لیکن اس حدیث کے صادق آنے کیلیے جن لوگوں کو مجدد دین کا لقب دیا گیا، ان میں سے اکثر معمولی درجہ کے لوگ ہیں۔ یہانتک کہ علامہ سیوطی بھی اس منصب کے امیدوار ہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے مجدد کے رتبہ کا اندازہ نہیں کیا۔ مجدد یا رفارمر کےلیے تین شرطیں ضروری ہیں،

(۱) مذہب یا علم یا سیاست (پالٹیکس) میں کوئی مفید انقلاب پیدا کرے،

(۲) جو خیال اُسکے دل میں آیا ہو کسی کی تقلید سے نہ آیا ہو، بلکہ اجتہاد ہو،

(۳) جسمانی مصیبتیں اُٹھائی ہوں، جان پر کھیلا ہو، سرفروشی کی ہو،

یہ شرائط قدما میں بھی بہت کم پائے جاتے ہیں اور ہمارے زمانہ میں تو رفارمر ہونے کے لیئے صرف یورپ کی تقلید کافی ہی،

تیسری شرط، اگر ضروری قرار نہ دیجائے، تو امام ابوحنیفہ، امام غزالی، امام رازی شاہ ولی اللہ صاحب اس دائرہ میں آسکتے ہیں لیکن جو شخص رفارمر کا اصلی مصداق ہوسکتا ہے وہ علامہ ابن تیمیہ ہیں ہم اس بات سے واقف ہیں، کہ بہت سے

امور میں امام غزالی وغیرہ کو ابن تیمیہ پر ترجیح ہے، لیکن وہ امور مجددیت کے دائرے سے باہر ہیں، مجددیت کی اصلی خصوصیتیں جسقدر علامہ کی ذات میں پائی جاتی ہیں انکی نظیر بہت کم مل سکتی ہے، اسلیے ہم اس عنوان کے ذیل میں علامہ موصوف کے حالات اور انکی مجددیت کے خصوصیات لکھنا چاہتے ہیں،

نام و نسب و ولادت احمد نام عرف ابن تیمیہ تقی الدین لقب سلسلہ نسب یہ ہے، احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام بن عبد اللہ بن الخضر بن علی بن عبد اللہ بن تیمیۃ الحرانی، دمشق کے علاقہ میں حران ایک مقام کا نام ہے، ان کے آبا و اجداد یہیں کے رہنے والے تھے، ان کے دادا محمد بن خضر کی والدہ کا نام تیمیہ تھا وہ نہایت قابل تھیں، اور وعظ کہا کرتی تھیں، علامہ موصوف انھیں کی طرف منسوب ہو کر ابن تیمیہ کے نام سے مشہور ہیں، علامہ کے خاندان میں سات آٹھ پشت سے درس و تدریس کا مشغلہ چلا آتا تھا، اور وہ سب لوگ علم و فن میں ممتاز گذرے، علامہ کے والد عبد الحلیم بہت بڑے عالم تھے، فن حدیث میں انکو کمال حاصل تھا۔

علامہ موصوف دوشنبہ کے دن ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱؁ہجری میں بمقام حران پیدا ہوئے یہ وہ زمانہ تھا کہ تاتاری بغداد کو غارت کر کے شام کی طرف پھیل رہے تھے، اور جدھر جاتے تھے ملک کے ملک برباد کرتے جاتے تھے علامہ کے والد اسی پریشانی میں رات کو چھپکر تمام خاندان کے ساتھ حران سے نکلے، الگ الگ سواری کا بندوبست نہ تھا اس لیے سب کے سب ایک گاڑی میں بیٹھے، کتابیں بھی اسی گاڑی میں رکھ لیں، تاتاری بھی

؎۱ علامہ ابن تیمیہ کے حالات، اگرچہ اکثر کتابوں میں مذکور ہیں لیکن طبقات الحنابلہ میں ابن رجب حنبلی نے جو خود علامہ موصوف کے شاگرد کے شاگرد ہیں، ان کا حال زیادہ تفصیل سے لکھا ہے، ذیل ابن خلکان اور طبقات الحفاظ میں بھی مفید حالات ہیں، حافظ ابن حجر نے دُرر کامنہ میں نہایت دلچسپ اور مفید حالات لکھے ہیں، لیکن میرے پاس اس کتاب کا جو نسخہ تھا نہایت غلط تھا، اسلیے اکثر جگہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکا

تعاقب میں تھے لیکن خدا نے بچالیا اور گرتے پڑتے دمشق پہونچ گئے یہ سنہ ۶۶۷ ہجری کا واقعہ ہے اسوقت علامہ کی عمر ۶ برس کی تھی، علامہ نے والد کے اشارہ سے دمشق میں علم کی تحصیل شروع کی، دس برس عمر نہیں ہونے پائی تھی کہ نحو، صرف، ادب وغیرہ سے فراغت حاصل کی، ۱۷ برس کی عمر تک پہونچتے پہونچتے فتوے دینے کے قابل ہوگئے تصنیف وتالیف بھی اسی عمر میں شروع ہوگئی، ۲۱ برس کی عمر میں انکے والد کا انتقال ہوگیا، وہ متعدد مدارس میں مدرس تھے، ان کے بعد ان تمام مدرسوں میں باپ کا عہدہ انکو ملا۔

علامہ موصوف نے جن اساتذہ سے علوم کی تحصیل کی، انکی تعداد دو سو تک پہونچتی ہے یہ بات یادرکھنے کے قابل ہے کہ انکے اساتذہ میں زینب بھی ہیں جو ایک فاضل خاتون تھیں، سنہ ۶۸۱ ہجری میں دارالحدیث سکریہ میں جو خاص فن حدیث کا درسگاہ تھا۔ پہلا درس دیا۔ اس درس میں بڑے بڑے علما اور فضلاء استفادہ کی غرض سے شریک ہوئے چنانچہ قاضی القضاۃ بہاء الدین، شیخ تاج الدین فزاری، زین الدین ابن مرحل، شیخ زین الدین بن منجا، تک شریک تھے۔

علامہ نے صرف بسم اللہ سے متعلق اسقدر نکات اور دقائق بیان کیے، کہ لوگ حیرت زدہ رہ گئے، تاج الدین فزاری نے یہ تقریر حرف بحرف قلمبند کی، اسی زمانہ میں جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد قرآن مجید کی تفسیر پر ابتدا سے بہ ترتیب درس دینا شروع کیا، یہ درس اسقدر مفصل اور بسیط ہوتا تھا کہ سورۂ نوح کی تفسیر کئی برس میں تمام ہوئی۔

انکے علم وفضل کا شہرہ اسقدر عام ہوتا جاتا تھا کہ سنہ ۶۹۰ ہجری سے پہلے پہلے یعنے جب انکی عمر ۳۰ برس کو بھی نہ پہونچی تھی، قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا گیا، لیکن اُنھوں نے انکار کیا، سنہ ۶۹۱ ہجری میں حج کو گئے، اور جب واپس آئے تو تمام ملک میں انکے فضل وکمال

سلہ طبقات الحنابلہ،

کا سکہ جم چکا تھا، لیکن اس حسن قبول کے ساتھ مخالفت کا سامان بھی جمع ہوتا جاتا تھا اسلامی فرقوں میں سے اشعری اور حنبلی آپس میں حریف مقابل تھے، لیکن امام رازی نے اشاعرہ کے مذہب کو اسقدر مدلل اور روشن کر دیا تھا کہ حنبلی مذہب گویا بجھ چلا تھا۔ علامہ ابن تیمیہ حنبلی تھے اور اُنکے نزدیک حنبلیوں کی رائے صحیح تھی، اسلیے انھوں نے دلیری سے حنابلہ کے ان خیالات کا اظہار کیا، ۶۹۸ھ ہجری میں ایک استفتا اُن کے پاس اسکے متعلق آیا۔ انھوں نے دو تین گھنٹہ میں اس کا لمبا چوڑا جواب لکھا، جو حمویہ کے نام سے مشہور ہے، اس میں نہایت تفصیل سے اشعریوں کی غلطی ثابت کی، یہ پہلا دن تھا کہ اُن کی عداوت اور مخالفت کی صدا بلند ہوئی فقہانے ان سے جاکر بحث کی لیکن قاضی امام الدین قزوینی ان کے طرفدار ہو گئے، اور کہا کہ جو شخص علامہ کے مخالف کوئی بات کہے گا میں اسکو سزا دونگا، شورش یہانتک بڑھی کہ قاضی حنفی نے منادی کرا دی کہ ابن تیمیہ فتوے نہ دینے پائیں لیکن حکام میں سے ایک صاحب اثر نے علامہ کی طرفداری کی اور فتنہ فرو ہوگیا[۱]،

۷۰۵ھ ہجری میں یہ فتنہ پھر بڑے زور شور سے اُٹھا یہانتک کہ شاہی حکم آیا کہ نائب السلطنت افرم علما و فضلا کے مجمع میں علامہ کا اظہار لیں، غرض ۷۰۵ھ ہجری میں تمام قضاۃ اور علما ایوان شاہی میں جمع ہوئے، اور علامہ کو بلوا بھیجا، وہ اپنی تصنیف عقیدۂ واسطیہ ہات میں لیکر آئے اور اسکو پڑھ کر سنایا۔ تین جلسوں میں پوری کتاب ختم ہوئی پھر ۲۔ صفر ۷۰۵ھ ہجری کو مناظرہ کی مجلس منعقد ہوئی اور علامہ صفی الدین ہندی افسر مناظرہ مقرر ہوئے، پھر کسی وجہ سے انکے بجائے کمال زملکانی جو مشہور محدث تھے، اس خدمت پر مامور ہوئے، بالآخر سب نے تسلیم کیا کہ علامہ کے عقائد اہل سنت کے عقائد ہیں، چند روز کے بعد شاہی فرمان آیا کہ علامہ پر جو الزام لگائے گئے تھے غلط تھے

---

[۱] فوات الوفیات، ص ۳۵ و ۳۶، کامنہ حالات ابن تیمیہ، ص ۲۵۲ طبقات الحنابلہ ابن رجب،

حافظ ابن حجر نے درر کامنہ میں لکھا ہے کہ علامہ نے اقرار کیا کہ میرے عقائد امام شافعی کے عقائد ہیں۔

۱۲ رجب ۷۰۵ھ کو علامہ مزی نے بخاری کی کتاب افعال العباد کا درس جامع مسجد میں دیا، اس پر بعض شافعیوں کو خیال ہوا کہ اسکا روئے سخن ہماری طرف ہے، چنانچہ قاضی شافعی سے جا کر شکایت کی، قاضی نے اُلٹا اُسی کو قید کر دیا، علامہ ابن تیمیہ کو خبر ہوئی تو خود گئے اور بزور اسکو قید خانہ سے چھڑا لائے، قاضی صاحب یہ سنکر قلعہ میں گئے کہ نائب السلطنت سے اسکی شکایت کریں اتفاق سے علامہ بھی وہیں موجود تھے، رو در رو گفتگو ہوئی اور سخت کلامی تک نوبت پہونچی، بالآخر نائب السلطنت نے رفع فساد کے لیے منادی کرا دی کہ جو شخص ان عقائد کا اظہار کریگا اُسکو سزا دیجائیگی،[1]

چند روز کے بعد یہ فتنہ پھر اُٹھا، اُمرائے دربار میں سے بیبرس جاشنگیر حکومت کا دایاں ہاتھ تھا، اور وہ شیخ نصر منبجی کا نہایت معتقد تھا، شیخ نصر، علامہ ابن تیمیہ اور ان کے عقائد کے سخت مخالف تھے، یہانتک کہ بعض لوگوں کو اس جرم پر قتل کرا چکے تھے، انھوں نے بیبرس کو آمادہ کیا کہ علامہ دمشق سے قاہرہ میں طلب کیے جائیں چنانچہ ۲۔ رمضان ۷۰۵ھ کو علامہ ڈاک میں بیٹھ کر دمشق سے قاہرہ آئے اور اس کے دوسرے دن قلعہ میں دربار عام ہوا، قاضی ابن مخلوق مالکی حکم ہو کر بیٹھے، ایک شخص جس کا نام ابن عدلان تھا، اسنے اظہار دیا کہ ابن تیمیہ اس بات کے قائل ہیں، کہ خدا حرف اور الفاظ کے ذریعہ سے بولتا ہے اور اسکی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جا سکتا ہے،

پھر اسنے قاضی ابن مخلوق کی طرف دیکھا کہ کیا ایسا شخص قتل کا مستحق نہیں ہے؟

قاضی صاحب نے علامہ کی طرف خطاب کیا، علامہ نے خطبہ (لکچر) کے طور پر جواب

[1] یہ واقعات صرف درر کامنہ میں ہیں، ص ۵۲ درر کامنہ،

دینا چاہا، اسلیے پہلے حمد و ثنا شروع کی، قاضی نے کہا جلد جواب دو، علامہ بولے کہ کیا حمد و ثنا نہ کروں، قاضی نے کہا اچھا وہ بھی ہو چکی، اب تو جواب دو، علامہ چپ ہو رہے جب زیادہ اصرار ہوا تو انھوں نے کہا کہ حکم کون ہی؟ لوگوں نے قاضی صاحب کی طرف اشارہ کیا، چونکہ وہ اشعری تھے، علامہ نے کہا یہ خود فریق مقدمہ ہیں، حکم کیونکر ہو سکتے ہیں، اس پر لوگ برہم ہوئے اور علامہ کو مجلس سے اُٹھا دیا، علامہ کے بھائی شیخ شرف الدین بھی اس معرکہ میں موجود تھے، وہ بھی علامہ کے ساتھ اُٹھے، اور انکے مُنھ سے بد دعا نکلی، علامہ نے روکا اور کہا کہ یوں کہو

غرض قاضی مالکی کے حکم سے علامہ قلعہ کے قیدخانے میں بھیجے گئے، لیکن جب قاضی صاحب کو معلوم ہوا کہ قیدخانہ میں کچھ روک ٹوک نہیں، لوگ علامہ سے بے تکلف ملتے جلتے ہیں، تو انھوں نے کہا کہ ابن تیمیہ کا کفر ثابت ہو چکا ہی، اسلیے فرض تو یہی تھا کہ وہ قتل کر دیے جاتے، لیکن کم از کم قیدخانے کی سختی ضرور رہے، غرض عید کے دن قلعہ سے منتقل ہو کر حُبِ یوسف میں جو نہایت تنگ و تاریک قیدخانہ ہی قید کیے گئے اسی زمانہ میں ایک فرمان نافذ ہوا کہ جو شخص ابن تیمیہ کا ہمخیال ہوگا قتل کر دیا جائے گا یہ فرمان ابن شہاب محمود نے جامع مسجد میں جا کر پڑھا، حنبلی فرقہ کے لوگ ہر جگہ سے گرفتار ہو کر آئے اور ان سے یہ اقرار لیا گیا کہ وہ شافعی العقیدہ[۱] ہیں، قاہرہ میں حنبلیوں کو طرح طرح کی سزائیں دی گئیں کہ وہ ابن تیمیہ کے عقیدہ سے باز آئیں،

عجیب بات یہ ہی کہ اس عام آشوب میں علامہ کی جسنے حمایت کی وہ شمس الدین ابن الحویری تھے جو مذہبا حنفی تھے، انھوں نے ایک محضر لکھا جسمیں یہ عبارت لکھی کہ تین سو برس سے ابن تیمیہ کا کوئی ہمسر نہیں پیدا ہوا، اس جرم کی سزا میں شمس الدین کی معزولی کی کوشش کی گئی چنانچہ وہ اگلے سال معزول کر دیے گئے[۲]

---

[۱] درر کامنہ، [۲] درر کامنہ،

اتفاق یہ کہ سالار جو سلطان ناصر کا دست و بازو تھا، علامہ کی حمایت پر آمادہ ہوا، اُسنے تینوں مذہب کے فقہا کو جمع کیا، اور خواہش کی کہ علامہ قید سے رہا کردیے جائیں سب نے بالاتفاق فیصلہ کیا کہ اگر وہ چند شرائط قبول کریں اور بعض عقائد سے باز آئیں تو البتہ انکی رہائی ہوسکتی ہے، چنانچہ ان شرائط کے قبول کرنے کے لیے علامہ طلب کیے گئے لیکن وہ نہ آئے، بار بار انکو پیغام بھیجا گیا لیکن اُنکو خیال آزادی کے مقابلہ میں اپنا قید ہونا گوارا تھا[1]۔

اس زمانہ کے واقعات سے متعلق ایک تحریر خود علامہ کی ہماری نظر سے گذری ہے، اس کا نام مناظرہ مصریہ ہے، اُسکے دیباچہ میں لکھتے ہیں، کہ دو سنہ ۷۰۶ ہجری میں دو شاہی عہدہ دار میرے پاس آئے کہ چل کر علما کے سامنے اپنے عقائد کا ثبوت بیان کیجیے، میں نے کہا سال بھر سے تم لوگ میرے خلاف لوگوں کے بیان سنتے رہے، اور کبھی مجھ کو جواب کا موقع نہیں دیا، اب ایک دفعہ تنہا میرا بیان بھی سُن لو، پھر مجمع عام میں گفتگو ہوگی، دونوں عہدہ دار واپس گئے اور یہ پیغام لائے کہ آپ کو مجبوراً چلنا ہوگا میں نے انکار کیا، وہ لوگ واپس گئے اور پھر یہ پیغام لائے کہ فلان فلان عقیدوں سے باز آؤ، میں نے اسکے جواب میں یہ رسالہ لکھا،

لطیفہ جن دنوں علامہ قید میں تھے، باہر کے ایک رئیس نے علامہ کی صورت کا ایک آدمی دیکھا متعجب ہوکر پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ اسنے کہا کہ ابن تیمیہ رئیس کو نہایت تعجب ہوا، اسنے ماردین کے رئیس کو اس واقعہ کی اطلاع دی، رئیس ماردین نے بادشاہ مصر کو لکھا، لوگوں کو نہایت حیرت ہوئی، علامہ نے اس واقعہ کو ایک ضمنی موقع پر رسالہ الفرقان میں لکھا ہے[2] اور یہ خیال ظاہر کیا ہے، کہ وہ غالباً جن تھا لیکن حقیقت یہ ہو کہ علامہ کی عظمت و شان نے اس رئیس کے دل میں ایک خیالی صورت پیدا کی جو مجسم ہوکر نظر آئی

۱؎ طبقات درر کامنہ، سنہ ۵ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۷۱،

جن کا خیال علامہ کی وہم پرستی ہی، (جن کے وجود سے انکار نہیں لیکن جن یُوں صورت بدل کر لوگوں کے پاس آیا جایا نہیں کرتے)

غرض ڈیڑھ برس تک علامہ قید خانہ میں رہے، انکے بھائی بھی ساتھ تھے، معمول تھا کہ قیدیوں کو کھانا کپڑا حکومت کی طرف سے ملتا تھا، لیکن علامہ نے عطیہ سلطانی سے بالکل انکار کیا، اور فقر و فاقہ سے بسر کی[1]،

ربیع الاول ۷۰۷ھ ہجری میں مُہنّا ابن عیسیٰ جو عرب کا مشہور رئیس تھا مصر میں آیا، اور قید خانہ جا کر علامہ کو چھوڑا لایا، اس کے بعد متعدد جلسے منعقد کیے، اور تمام علما و فضلا کو جمع کیا، جس میں علامہ نے مسائل متنازع فیہ پر گفتگو کی۔ صاحب طبقات نے علامہ ذہبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ علامہ نے قتل کے ڈر سے بعض مسائل میں اتفاق کیا، لیکن صاحب وفیات نے جو علامہ کا شاگرد ہے لکھا ہے، کہ علامہ نے حریفوں کو زور استدلال سے مغلوب کر لیا، بہرحال علامہ قید خانہ سے نکل کر درس و تدریس میں مشغول ہوئے، اور چند روز کے لیے انکو اطمینان نصیب ہوا،

سلسلہ سخن کے اتصال سے ہم بہت دور نکل آئے، اور بیچ کے اہم واقعات جن میں علامہ نے ملکی معاملات انجام دیے چھوٹ گئے، علامہ موصوف علما کی طرح اپنا فرض منصبی صرف نماز روزہ ادا کرنا نہیں سمجھتے تھے بلکہ اُن کے نزدیک مہمات سیاست میں دخل دینا بھی علما کے فرائض میں داخل تھا، ۶۹۹ھ ہجری میں جب انکی عمر ۱۸۔۱۹ برس کی تھی، غازان خان بن ہلاکو خان نے شام پر حملہ کیا، سلطان ناصر بادشاہ مصر اُس کے مقابلہ کو نکلا، لیکن بڑے معرکے کے بعد شکست کھائی، غازان خان نے آگے بڑھ کر حمص پر قبضہ کر لیا، اسکی آمد آمد کی خبر سنکر دمشق میں اسقدر ابتری پھیلی کہ عام غارتگری شروع ہوگئی، علامہ ابن تیمیہ یہ حالت دیکھکر خود غازان خان کے پاس گئے، اور اُس سے امن

[1] طبقات الحنابلہ،

کافرمان لیکر آئے، عام لوگ تو یہ سنکر مطمئن ہو گئے، لیکن فوج نے نہ مانا اور شہر کو لوٹنا شروع کر دیا، علامہ ابن تیمیہ نے شیخ الشیوخ نظام الدین محمود کو لیکر شہر کا بندوبست اور امن وامان قائم کیا، پھر غازان سے جاکر ملاقات کی، اسکے بعد تاتاری فوجیں بیت المقدس وغیرہ پر بڑھیں، اور ہزاروں آدمی گرفتار کر لیے علامہ غازان کے سردار لشکر کے پاس گئے اور بہت سے قیدیوں کو چھڑا کر لائے۔

سنہ ۶۹۹ ہجری میں غازان خان نے بڑے زور شور سے شام کے حملہ کی تیاری کی، قتلوشاہ اور تولائے جو اسکے سپہ سالار تھے، فوجیں لیکر آگے بڑھے، یہ خبر سنکر علامہ نے جاکر اُنسے گفتگو کی، اور اُن کو اس ارادہ سے روکا، ساتھ ہی جہاد کا سامان کیا، اور ہر قسم کی تیاریاں شروع کیں، اسوقت تو یہ فتنہ فرو ہو گیا لیکن سال بھر کے بعد تاتاریوں کا سیلاب پھر اُمنڈا، اور ہر طرف تاتاری فوجیں پھیل گئیں، علامہ ڈاک میں بیٹھکر مصر پہونچے، اور اعیان سلطنت سے مل کر اُنکو جہاد کی ترغیب دی، تمام شہر اُن سے ملنے کے لیے آیا یہانتک کہ علامہ تقی الدین بن دقیق العید، جو امام المحدثین اور قاضی القضاۃ تھے وہ بھی تشریف لائے مصر کے لوگوں کو آمادہ کر کے علامہ دمشق کو واپس گئے اور جہاد کی طیاریاں کیں؛[1]

سنہ ۷۰۲ ہجری میں تاتاریوں نے پھر نہایت سروسامان سے شام پر چڑھائی کی قتلوشاہ اور چوپان جو سردار فوج تھے، نوے ہزار فوج لیکر بڑھے اسوقت شام سلطان ناصر کے قبضہ میں تھا، اسکو خبر ہوئی تو نہایت گھبرایا، ارکان دربار نے بھی ہمت ہار دی، علامہ یہ حالات سنکر ڈاک میں شام سے مصر پہونچے، اور بادشاہ سے مل کر نہایت دلیری سے اسکو غیرت دلائی، اور کہا کہ اگر تم اسلام کی حمایت نہ کرو گے تو خدا کسی اور کو بھیجے گا جو اس فرض کو انجام دیگا، اس کے بعد علامہ نے قرآن مجید کی یہ آیتیں پڑھیں،

---

[1] یہ تمام واقعات تاریخ ابن خلدون میں مذکور ہیں، جلد ۵ ذکر سلطنت اتراک مصر، ص ۵۲ فوات الوفیات

وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم	اگر تم پیٹھ دکھاؤ گے، تو خدا تمھارے بدلے اور قوم بھیجے گا اور وہ تمھاری طرح (بزدل) نہونگے،

علامہ نے جس دلیری اور بیباکی سے، بادشاہ سے گفتگو کی، تمام لوگوں کو حیرت ہوئی، امام تقی الدین بن دقیق العید کو بھی انکی جرات اور لطف استنباط پر حیرت ہوئی،

علامہ کو اس سفارت میں پوری کامیابی حاصل ہوئی، سلطان ناصر شام کی طرف بڑھا اور مرج الصفر میں جس کا دوسرا نام شقحب ہے، دونوں فوجیں معرکہ آرا ہوئیں، بڑے زور کارن پڑا، بالآخر تاتاریوں کی تمام فوجیں برباد ہوگئیں، ابن تیمیہ اس معرکہ میں، علامہ کے بجاے ایک بہادر سپاہی نظر آتے تھے۔

غازان خاں اور امراے تاتار کی سفارتوں میں، علامہ نے جس آزادی، اور دلیری سے سفارت کی خدمت انجام دی، اس کا اندازہ اس سے ہوگا، کہ ایک دفعہ جب وہ سپہ سالار قطلوخان کے پاس ایک شخص کی دادرسی کے لیے گئے تو قطلوخان نے استہزا کے طور پر کہا کہ آپ نے کیوں تکلیف کی، آپ نے بلا بھیجا ہوتا، میں خود حاضر ہوتا علامہ نے کہا نہیں حضرت موسی فرعون کے پاس خود جاتے تھے، فرعون حضرت موسی کے پاس نہیں آتا تھا۔

علامہ موصوف نے شیخ محی الدین اکبر وغیرہ کے متعلق متعدد رسالوں میں لکھا تھا کہ وہ وحدت وجود کے قائل ہیں، یعنے خدا، اور مخلوقات سب ایک ہیں، اور یہ مذہب اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے، اس پر صوفیوں نے حاکم شافعی سے جاکر شکایت کی، اسکے فیصلہ کے لیے ایک مجلس منعقد ہوئی، علامہ پر جو الزامات لگائے گئے تھے، وہ غلط ثابت ہوئے، لیکن علامہ نے یہ تسلیم کیا، کہ "میں رسول اللہ سے استغاثہ کرنے کو ناجائز سمجھتا ہوں"، اس پر لوگوں میں اختلاف رائے پیدا ہوا، بعض کہتے تھے کہ اسمیں

سنہ ۷۰۲ھ ابن خلدون اور طبقات الحنابلہ، ۱۲ سنہ ۷۰۵ھ فوات الوفیات،

کیا حرج ہے، لیکن حاکم بن جماعہ نے کہا کہ یہ خلاف ادب ہی، فیصلہ یہ ہوا کہ مقدمہ قاضی کے پاس بھیجدیا جائے، وہ احکام شریعت کے موافق فیصلہ کردیں، آخر سلطنت کی طرف سے یہ حکم صادر ہوا کہ علامہ کے سامنے دو باتیں پیش کیجائیں یا تو چند شرائط کے ساتھ چھوڑ دیے جائیں، یا اگر شرائط کے قبول کرنے سے انکار ہو تو قیدخانہ گوارا کریں،

علامہ نے قیدخانہ قبول کیا، لیکن ان کے احباب نے جو دمشق سے انکے ساتھ آئے تھے، اپنی طرف سے ذمہ داری کی کہ علامہ کو وہ شرطیں منظور ہیں، اس بنا پر دمشق جانے کی اجازت ملی، اور علامہ ڈاک میں روانہ ہوئے، لیکن دوسرے دن پھر واپس آنا پڑا، اور امرا اور قضاۃ نے پھر ایک مجمع کیا، مختلف لوگ مختلف رائیں دیتے تھے بعض نے قید کی رائے دی، قاضی مالکی نے کہا ان پر کوئی جرم ثابت نہیں ہی، نورالدین زواوی سے لوگون نے پوچھا، تو متحیر ہوے کہ کیا جواب دیں، علامہ نے دیکھا کہ انکی وجہ سے لوگون میں اختلاف آرا ہوتا ہے، بولے کہ میں خود قیدخانہ میں جاتا ہوں، زواوی نے کہا اگر قیدخانہ میں بھیجے جائیں تو وہاں انکی شان سے مناسب اُنسے برتاؤ کیا جائے، لیکن اوروں نے کہا یہ نہیں ہوسکتا، سلطنت اسکو منظور نہیں کرسکتی، قیدخانہ میں عام قیدیوں کی طرح رہنا ہوگا، غرض قیدخانہ میں بھیجے گئے لیکن احترام قائم رہا خدام کو انکے ساتھ رہنے کی اجازت دیگئی۔ ہر شخص کو انکے پاس آنے جانے کا مجاز تھا، چنانچہ مشکل مشکل فتوے لیکر لوگ آتے تھے، اور علامہ انکے جواب لکھتے تھے، اکثر لوگ برکت کی غرض سے ملنے جاتے تھے خاص ان کے یاران صحبت کو بھی آزادی حاصل تھی، بے تکلف ان سے مل سکتے تھے[۱]،

سلطان مظفر کی چند روزہ[۲] سلطنت میں قاہرہ سے اسکندریہ بھیجدیے گئے

---

[۱] طبقات ابن رجب،

[۲] درر کامنہ میں لکھا ہی کہ قاضی زین بن مخلوف نے ان کو نائب السلطنت سے کہکر، اسکندریہ کے

اور ایک وسیع خوش منظر برج میں نظر بند کیے گئے لیکن یہاں بھی ہر طرح کی آزادی حاصل تھی نہانے کے لیے حمام میں جا سکتے تھے، جب دوبارہ سلطان ناصر کو غلبہ حاصل ہوا اور سلطان مظفر قتل کر دیا گیا، تو سلطان نے حکم دیا کہ علامہ نہایت عزت و احترام کے ساتھ قاہرہ میں بلائے جائیں، چنانچہ ۷۰۹ھ ہجری میں نہایت احترام کے ساتھ قاہرہ میں آئے، سلطان نے دربار میں بلایا، اور جب وہ آئے تو کھڑے ہو کر تعظیم دی،

سلطان نے مجمع عام میں، علامہ کی نہایت تعریف کی، جس سے غرض یہ تھی کہ لوگ انکی مخالفت سے باز آئیں، سلطان نے یہ بھی ارادہ کیا، کہ علامہ کے مخالفوں کو سزا دے چنانچہ خود علامہ سے مشورہ کیا، لیکن انھوں نے باز رکھا، ابن مخلوق جو علامہ کے قتل کے درپے تھے، اس موقع پر موجود تھے، علامہ نے ان سے بھی درگذر کی چنانچہ وہ کہا کرتے تھے، کہ میں نے ابن تیمیہ جیسا جوانمرد نہیں دیکھا، میں نے انکے قتل کی کوشش کی لیکن جب مجھپر انکو قابو ملا تو معاف کر دیا۔

مہینہ بھر کے بعد سلطان نے پھر علامہ کو طلب کیا، اور اُن سے ملاقات کی، سلطان کی حسن عقیدت کی وجہ سے علامہ کا آستانہ مرجع عالم و عالم بن گیا، امرا، اہل فوج درباری سب آتے تھے، اور نہایت عزت و احترام سے ملتے تھے، لیکن بعضوں کو اسقدر عناد تھا، کہ اس حالت میں بھی شرارت سے باز نہ آتے تھے، ان میں ایک بزرگ فقیہ بکری تھے، انھوں نے ایک دن علامہ کو اکیلا پا کر گریبان پکڑ لیا، اور کہا کہ عدالت میں چلو مجھکو تم پر استغاثہ کرنا ہے، زیادہ شور و غل ہوا، تو اِدھر اُدھر سے لوگ جمع ہو گئے فقیہ صاحب بھاگ نکلے، اتفاق یہ کہ ایک مدت کے بعد کسی بات پر سلطان فقیہ صاحب سے ناراض ہوا اور حکم دیا، کہ انکی زبان کٹوا دیجائے، علامہ کو خبر ہوئی سلطان کے پاس

(بقیہ صفحہ ۱۹۵) قیدخانہ میں بھجوایا تھا، کہ کوئی ان سے ملنے نہ پائے، لیکن لطف یہ ہے کہ جب قاضی صاحب نے یہ حکم بھجوایا تھا، تو مرض الموت میں گرفتار تھے۔ حسن خاتمہ بغیر اسکے کیونکر ہو سکتا تھا، ۵؎ طبقات،

جاکر سفارش کی اور اتنی بات پر معاملہ ٹل گیا کہ وہ فتوے نہ دینے پائیں،

سنہ ۷۱۲ھ ہجری میں سلطان تاتاریوں کے مقابلہ کے لیئے شام کو روانہ ہوا علامہ بھی جہاد کی غرض سے ساتھ ہوئے، اور عسقلان تک ساتھ ساتھ آئے، یہاں سے بیت المقدس کی زیارت کے لیے گئے، زیارت سے فارغ ہوکر سات برس کے بعد دمشق میں آئے، ان کے بھائی اور اکثر شاگرد بھی ساتھ تھے، شہر کے لوگوں کو خبر ہوئی تو تمام شہر اُمنڈ آیا، بڑی دھوم دھام سے شہر میں داخل ہوئے، اور جن مدارس میں درس دیتے تھے وہاں درس دینا شروع کیا،

سنہ ۷۱۸ھ[۵۱] ہجری میں علامہ نے حلفِ طلاق کے متعلق جمہور فقہا کے مخالف رائے ظاہر کی، اس پر پھر ہنگامہ برپا ہوا، یہانتک کہ لوگوں نے حکام سے شکایت کی، اور امن وامان قائم رہنے کی غرض سے بادشاہی فرمان صادر ہوا کہ وہ فتوے نہ دینے پائیں، شہر میں اسکی عام منادی کرادی گئی لیکن علامہ نے کہا کہ حق کا چھپانا جائز نہیں۔ چنانچہ عام طور پر فتوے دیتے رہے، بالآخر سلطان کے حکم سے قید کیے گئے، اور قلعہ میں بھیجدیے گئے ۵ مہینے کے بعد سنہ ۷۲۱ھ ہجری میں رہائی ملی، اور بدستور پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہوئے، لیکن جو عام ناراضی پھیل چکی تھی اس کی آگ رہ رہ کر سلگتی اور بھڑکتی تھی، بیس برس پہلے علامہ نے ایک فتویٰ لکھا تھا کہ صرف زیارت کے ارادہ سے مدینہ منورہ کا سفر کرنا شرعاً ثابت نہیں، یہ فتویٰ ایک فتنہ خوابیدہ تھا۔ جسکو موقع پاکر لوگوں نے جگایا، اور تمام شہر میں آگ سی لگ گئی، اٹھارہ بڑے بڑے فقہا نے علامہ کے کفر کا فتویٰ دیا جن کے سرگروہ قاضی اخنائے مالکی تھے، چاروں مذہب یعنی حنفی، شافعی، مالکی حنبلی فقہا سے فتویٰ لیا گیا، سب نے بالاتفاق علامہ کی قید کا فتویٰ[۵۲] دیا، چنانچہ شعبان سنہ ۷۲۶ھ

---

۵۱ درر کامنہ میں حافظ ابن حجر نے اسکو سنہ ۷۱۹ھ ہجری کا واقعہ بتایا ہے،

۵۲ طبقات،

میں شاہی فرمان کی رو سے وہ دمشق کے قلعہ میں قید کر دیے گئے، ان کے بھائی شرف الدین پر اگرچہ جرم نہ تھا، لیکن انکی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ بھائی کو تنہا چھوڑ دیں اپنی خوشی سے قیدخانہ میں آگئے، ۲۴ جمادی الاولی کو قیدخانہ ہی میں انکا انتقال ہو گیا انکے جنازہ کی نماز قلعہ سے باہر پڑھی گئی، لیکن علامہ کو بھائی کے جنازہ میں شرکت کا موقع نہ دیا گیا مجبوراً قید ہی کی حالت میں قلعہ کے اندر نماز ادا کی، چونکہ تکبیر کی آواز اندر تک آتی تھی، اسلیئے نماز کے ارکان میں فرق نہ آیا، لیکن بھائی کا بھائی کے جنازہ میں نہ شریک ہو سکنے پر سب کو رقت ہوئی، اور لوگ بہت روئے[1]،

قید کی حالت میں بھی علامہ کا پاس ادب محفوظ رکھا گیا، اُنکے رہنے کو بہت اچھا کمرہ دیا گیا، کمرہ ہی میں پانی کا انتظام بھی تھا خدمت کے لیے ایک وفادار نوکر موجود تھا، علامہ نے یہاں نہایت اطمینان سے تصنیف و تالیف شروع کی، قرآن مجید کے حقائق پر بہت کچھ لکھا، کہا کرتے تھے کہ مجھکو یہاں جو نکات اور حقائق خدا نے القا کیے کبھی نہیں کیے تھے، افسوس ہے کہ قرآن کے سوا میں نے اپنی زندگی اور تصنیفات میں کیوں صرف کی، جس مسئلہ پر علامہ کو سزا ملی تھی، اسکے متعلق نہایت مفصل مضامین لکھی، احباب اور اہل فتوے کو خطوط اور فتوے بھی لکھتے رہتے تھے، یہ تحریریں ملک میں پھیلیں، تو رفع فساد کے لیے حکم دیا گیا کہ ان کے پاس قلم دوات وغیرہ کوئی چیز نہ رہنے پائے، اسکے بعد علامہ نے جو سب سے اخیر تحریر لکھی وہ چند سطریں تھیں، جن کا مضمون یہ تھا کہ مجھکو اگر اصلی سزا دیگئی تو وہ صرف یہی ہے، یہ سطریں علامہ نے کوئلے سے لکھی تھیں،

اب علامہ ہمہ تن ذکر و عبادات، تلاوت قرآن، مجاہدہ اور ریاضت میں مشغول ہوئے، بالآخر بیمار ہوئے اور ۲۰ دن بیمار رہکر دوشنبہ کی رات ذوقعدہ ۷۲۸ھ

[1] طبقات ذکر عبداللہ بن عبدالحلیم، شرف الدین،

میں وہ آفتاب علم دنیا کی افق سے چھپ گیا، اور تمام عالم میں تاریکی چھاگئی،

رفتم واز رفتن من عالمے تاریک شد　　　من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

علامہ کی زندگی تک، تو زمین اور آسمان اُن سے دشمن تھے، لیکن جب اُنکے مرنے کی خبر پھیلی، تو تمام ملک پر سناٹا چھاگیا، مؤذن نے جامع مسجد کے مینار پر چڑھ کر اعلان دیا، پولیس والوں نے برجوں سے منادی کی، دفعۃً تمام دکانیں بند ہوگئیں، نائب الحکومت کے پاس جاکر لوگوں نے تعزیت کی رسم ادا کی، ائمۂ محدثین امام مزی وغیرہ نے غسل دیا، قلعہ میں کثرت کی وجہ سے تل دھرنے کی جگہ نہیں رہی، قلعہ سے لیکر جامع مسجد تک آدمیوں کی بھیڑ تھی، شہر کا شہر اُمنڈ آیا، جامع مسجد سے قلعہ تک ٹھٹ لگ گئی، جنازہ جامع مسجد میں لاکر رکھا گیا، ہجوم اور کشمکش سے بچانے کے لیے ہر طرف فوجیں متعین ہوگئیں، سب سے پہلے قلعہ میں شیخ محمد تمام کی امامت سے جنازہ کی نماز پڑھی گئی، پھر جامع دمشق میں نماز ہوئی، جب جنازہ چلا تو یہ کثرت تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا، لوگ دُور سے رومال عمامے، چادر پھینکتے تھے، کہ جنازہ سے چھو جائے۔

جنازہ سروں پر چلتا تھا، اور آگے بڑھ بڑھ کر، کشمکش سے پیچھے ہٹ ہٹ جاتا تھا ہرچند پہلے سے کچھ اطلاع نہ تھی، فقہا اور مفتیوں نے شہر کو علامہ کا دشمن بنادیا تھا، تاہم ڈھائی لاکھ آدمی جنازہ کے ساتھ تھے، جن میں پندرہ ہزار عورتیں تھیں، رستہ میں لوگ زار زار روتے جاتے تھے، پردہ نشین عورتیں بالاخانوں اور کوٹھوں پر جنازہ کی طرف منھ کرکے نوحہ کرتی تھیں، نماز میں صف قائم نہ رہ سکی، صف سے صف اسطرح پیوستہ تھی کہ بیٹھنا تک ناممکن تھا، اسی حالت میں ایک شخص نے پکارا کہ "اہل سنت کا جنازہ یوں اُٹھتا ہے" اس پر کہرام پڑگیا، اور تمام فضا گونج گئی،

سلہ فوات الوفیات،

علامہ کے بھائی زین الدین نے نماز پڑھائی، اور مقبرہ صوفیہ میں اپنے بھائی شرف الدین کے پہلو میں دفن ہوئے،

اسوقت ریل، اور جہاز نہ تھے، لیکن فوراً تمام دنیائے اسلام میں یہ خبر پھیل گئی اور ہر جگہ نمازیں پڑھی گئیں، مسافروں نے بیان کیا، کہ چین میں انکے جنازہ کی نماز پڑھی گئی، اور منادی یہ پکارتا تھا، کہ الصلوۃ علی ترجمان القرآن (مفسر قرآن کی نماز)۔

[redacted]

سلہ یہ تمام واقعات طبقات ابن رجب اور فوات الوفیات سے لیے گئے،

PK
2199
S5M38